الیاس ٹریڈرس
شاہ علی بنڈہ روڈ، حیدرآباد

پہلا مجموعۂ نظمیات

بار اوّل ۲۰۰۰

بار دوم ۱۰۰۰

ناشر

مکتبۂ قصر الادب آگرہ

جولائی سنہ ۱۹۴۲ء

قیمت ــــــــــــ للعہ
۸/

(مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ)

تعارف

کارِ امروز

جل جلاله

اے ذات تو قدیم و کردگار امروز
وے ثابت باقی و وہاب امروز
دیدار ایں آفت و رحمت تو
لطف و کرمت نہاں کار امروز

صلی اللہ علیہ وسلم
اے سطوت دیروز و وقار امروز

کارِ امروز و دفترِ فردا

فارغ نشیں زِ اقتدارِ امروز
مستقبلِ تُست در کنارِ امروز
دانی کہ سوادِ دفترِ فردا چیست؟
یک نقطۂ افزودہ بکارِ امروز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نوائے تجدید

میں کہ اس ہنگامۂ ہستی میں صرف نالہ ہوں
خونچکاں اپنے لب فریاد کا تبخالہ ہوں

مجھ میں وہ ہیجانِ آب و رنگ و بو باقی نہیں
اب لہو جس سے ٹپکتا ہے وہ شاخِ لالہ ہوں

میری ہر اک جست سے پیدا ہیں لاکھوں بجلیاں
خرمنِ آتش زدہ کا شعلۂ جوالہ ہوں

زندگی کی ڈھونڈتے ہو مجھ میں کیا چنگاریاں
اک حریمِ عیش کی خاکسترِ صد سالہ ہوں

بادۂ پرجوش میرے جام میں باقی نہیں
روح میری ہستیٔ ناکام میں باقی نہیں

میں وہ خاکستر ہوں جو ہے پائمالِ انجمن
عبرت انگیز ایک تصویرِ مآلِ انجمن

ہوں تماشہ انقلابِ انجمن کا آج میں
تھا کبھی محو تماشائے جمالِ انجمن

ہے مرا انجام خوابِ دوش کا اک تکملہ
ہے زوالِ حال تعبیرِ کمالِ انجمن

یادگارِ سطوتِ دیرینۂ اسلاف ہوں
میری نظروں میں ہے تصویرِ جلالِ انجمن

سوگوارِ عشرتِ مرحومۂ دوراں ہوں میں
گم شدہ افسانۂ عالم کا اک عنواں ہوں میں

میرے نغمے گرمیٔ دنیائے عشرت تھے کبھی | میرے جلوے برقِ سینائے محبت تھے کبھی
اب وہ اک کمزور بھرّائی ہوئی آواز ہیں | جو ترانے صورِ حشرستانِ ملت تھے کبھی
انحطاط آمیز یہ اعضاء و اجزائے شباب | بر بنائے صحت و قوت قیامت تھے کبھی
آج جن جذبات پر عائد ہے الزامِ جمود | ہاں یہی پیغمبرِ الہامِ فطرت تھے کبھی

آج میں ناقص ہوں کل تکمیلِ موجودات تھا
میرا اک ہلکا سا نالہ حاصلِ نغمات تھا

پھر بھی میرے ساز میں آواز باقی ہے ابھی | بے پری میں قوتِ پرواز باقی ہے ابھی
عالمِ بالا سے جاری ہیں ابھی سرگوشیاں | خلوتِ الہام کا غماز باقی ہے ابھی
سیکڑوں اسرارِ قدرت میں نے کہہ ڈالے تو کیا | میرے دل میں اک اچھوتا راز باقی ہے ابھی
سننے والا ہو تو پھر نغمہ سرا ہو جاؤں میں | سوزِ فطرت میں مذاقِ ساز باقی ہے ابھی

نغمۂ نَو پھر لبِ خاموش میں بیتاب ہے
پھر مرے تارِ نفس پر بارشِ مضراب ہے

پھر خموشی سے مری پیدا ہے تفسیرِ حیات | خوابِ ہستی میں ہیں پھر آثارِ تعبیرِ حیات

ذرّے ذرّے سے مرے رخشاں ہیں لاکھوں آفتاب — خاکِ باقی سے مری رقصاں ہے تنویرِ حیات

پھر مری پستی سے ہو ایوانِ رفعت کی نمود — پھر مری ہستی سے ہے تحریکِ تدبیرِ حیات

پھر مری ہر سانس سے اک زندگی بیدار ہو — پھر مجھے منظور ہے تنظیم و تعمیرِ حیات

از سرِ نو نظمِ عالم مائلِ تجدید ہے
مقطعِ ہستی سے پیدا مطلعِ اُمّید ہے

شعلۂ احساس

بسکہ آزردۂ ویرانیِ محفل ہوں میں
خرمنِ سوختۂ عیش کا حاصل ہوں میں

غارتِ کیف، رمِ رنگِ چمن، ہجرتِ گل
کس قدر برہمیوں کا متحمل ہوں میں

انقلاب! اور یہ گردش کی غلط سامانی!
اپنی منزل ہی پہ آوارۂ منزل ہوں میں

منتشر ہیں مرے اسبابِ تموج یعنی
مضمحل موجۂ آبِ سرِ ساحل ہوں میں

جس پہ مشکل سے بھی ہوتا نہیں دل کا اطلاق
جسمِ ہستی کا وہ برباد شدہ دل ہوں میں

طے بہت جلد ہوئیں عالمِ ظاہر کی حدود
"کاروانم ہمہ بگذشت ز میدان شہود"

"مثلِ نقشِ کفِ پا نام و نشانم باقیست"

پھر مری آتشِ جذبات میں طغیانی ہے
سوز کی سرد شراروں میں فراوانی ہے

ازلی مشق ہے مٹ مٹ کے ابھرنا میرا
مانعِ مرگِ ابد میری گراں جانی ہے

پھر مجھے دے کوئی پیغامِ نواہائے بہار
پھر مجھے اپنی خموشی سے پریشانی ہے

خاکِ گلشن کو سکھانا ہے مذاقِ پرواز
پھر نشیمن پہ مجھے ذوقِ پرافشانی ہے

ہے تغیر میں مرا نقشۂ تنظیمِ حیات　　پھر بدلنے کو مری سوختہ سامانی ہے

بھر دے ماحولِ فسردہ میں نئی اک تنویر

"جرعہ اے فطرتِ افسردۂ گلشن برگیر"

"آتشِ عشق کہ در شعلہ تانم باقیست"

یا خدا ہستیٔ مرحوم پہ احساں کر دے　　پھر مرتب مرے اجزائے پریشاں کر دے

پھر بنا دے مجھے رنگینیٔ دامانِ بہار　　پھر گلستاں میں مجھے لالہ بداماں کر دے

جمع کر کے مرے سامان نوا سنجی کو　　بربطِ خامشیٔ عالمِ امکاں کر دے

برہمن سے ہو کہ زاہد سے کسی سے تو ہو ربط　　قابلِ دیر نہیں ہوں تو مسلماں کر دے

بن سکوں میں نہ اگر سروِ چراغانِ حرم　　عُود کی طرح شوالے ہی میں عریاں کر دے

چاہتا ہوں کہ بنوں گرمیٔ رنگِ محفل

"شعلئے باز بروں آر ز خاکسترِ دل"

"قوتِ جنبشِ نو در رگِ جانم باقیست"

صبحِ محبت

وہ بھی کیا محبت کی صبحِ پُر مسرت تھی، حُسن کی فضاؤں میں جب نمودِ جنت تھی
جذبۂ محبت سے تھی بھری ہوئی دنیا یہ فلک محبت تھا، یہ زمیں محبت تھی
رات کے حجابوں میں کوندتے تھے سیارے زلفِ شام سے پیدا صبح کی صباحت تھی
مہر تھا وہی تاباں جو ازل میں چمکا تھا دل میں ذرّے ذرّے کے جلوہ گر حقیقت تھی
ہر تبسّم اس کا تھا زندگی کا گہوارہ ہر ادا تھی اک مژدہ، ہر صدا بشارت تھی
انکھڑیوں کے پیمانے، مستیوں کے میخانے اک نظر محبت تھی، اک نظر صداقت تھی
ٹھوکروں میں پلتی تھی جاہ و حشمتِ عالم کیا نظر ہو دولت پر، جب نظر ہی دولت تھی
خشت و گل پہ کیا کرتی وہ سرِ جہاں بانی دل پر اختیار اُس کا، روح پر حکومت تھی
جب خفا ہوئیں نظریں، قہر تھا ہر اک تیور جب جبیں پہ بل آئے، ہر شکن سیاست تھی
اُس کے عہد میں عالم، اک جوانِ رعنا تھا اُسکے سایے میں دُنیا اک جہانِ عشرت تھی

آہ پھر گئی جب سے وہ نگاہ فطرت کی
یہ فنا زدہ دنیا قبر ہے محبت کی

نزولِ انساں

معمورۂ عالم میں ہر چیز مہیا تھی
رنگینیٔ و شادابیٔ فردوسِ تماشا تھی

ضو ریز سمندر میں مہتاب کی کرنیں تھیں
مقدم کی تمنا میں بے تاب فضائیں تھیں

دُنیا تو مکمّل تھی، انسان نہ تھا کوئی
اس بزم کی رونق کا سامان نہ تھا کوئی

ہستی کی ہر اک منزل از بسکہ اچھوتی تھی
جو شان تھی دُنیا کی مطلق ملکوتی تھی

پیکر تھا مگر زندہ آثار نہ تھے اس میں
تھا ساز مگر نغمے بیدار نہ تھے اس میں

اک خواب تھی یہ دنیا، رنگیں بھی معطر بھی
معدوم تھا ناظر بھی خاموش تھا منظر بھی

ناگاہ دھندلکے میں چھٹکے ہوئے تاروں سے
ماہِ شبِ آخر کے محجوب کناروں سے

مائل طرفِ عالم اک حور نظر آئی
ایجاد کے جلووں سے معمور نظر آئی

انسان در آغوشِ اک فردوس مکاں اتری
افلاک کی رفعت سے بالائے جہاں اُتری

ہمراہ مُسافر کے کچھ پھول تھے کچھ کلیاں
اک حُلّۂ فردوسی، احرامِ تنِ لرزاں

تازہ تھیں ابھی کلیاں اور پھول شگفتہ تھے
بہلانے کو انساں کے رنگین سا دھوکا تھے

سہما ہوا انساں تھا اندیشۂ غربت سے
ڈالے ہوئے ہاتھ اس کی گردن میں محبت سے

حائل کا اشارہ تھا وہ آئی تری دُنیا
کھول آنکھ کہ ہے یکسر رعنائی تری دُنیا

ہنگامۂ تازہ سے معمور اسے کر دے
لے اپنی تجلّی سے پُر نور اسے کر دے

انسانیت

آہ، اے انساں، تری انسانیت جاتی رہی
وہ فرشتوں کی سی اک معصومیت جاتی رہی

بھر گیا جہل و عناد و کبر سے تیرا دماغ
جو فروغِ ذہن تھی وہ ذہنیت جاتی رہی

کارگاہِ نفس نے روحِ حقیقت چھین لی
بارگاہِ قدس کی قدوسیت جاتی رہی

ماتم اے انساں! کہ خاک آلود پیکر میں ترے
مادّیت رہ گئی، روحانیت جاتی رہی

ہوا طلوع ستاروں کی دلکشی لے کر
سرور آنکھ میں نظروں میں زندگی لے کر

گذشتہ صبحِ محبت کو ڈھونڈنے نکلا
اک آفتاب محبت کی روشنی لے کر

خودی کے ہوش اُڑانے بصد نیاز آیا
نئے پیالوں میں صہبائے بیخودی لے کر

فضائے دہر میں گاتا پھرا وہ پریت کے گیت
نشاط خیز و سکوں ریز بانسری لے کر

رہا جمال سے انوار بار مدت تک
جبال و دشت میں فطرت کی چاندنی لے کر

جہانِ قلب سراپا گداز بن ہی گیا
ہر ایک ذرہ محبت کا ساز بن ہی گیا

جمال و حسن کے کافرنکھار سے کھیلا
ریاضِ عشق کی رنگیں بہار سے کھیلا

سمجھ کے عالمِ فانی کو ایک بازیچہ
کبھی چمن سے کبھی کوہسار سے کھیلا

پیمبر دل کی کبھی، رسم کی ادا اُس نے
گوالہ بن کے کبھی سبزہ زار سے کھیلا

بجا کے بانسری، نغموں پہ اپنے وجد کیا
خود اپنی زندگیِ پُر وقار سے کھیلا

بہا دئے کبھی ٹھوکر سے پریم کے چشمے
کبھی چمن کبھی گنگا کی دھار سے کھیلا

ہنسی ہنسی میں وہ دُکھ درد جھیلتا ہی رہا
کرشمہ باز زمانے سے کھیلتا ہی رہا

کیا زمانے کو معمور اپنے نغموں سے
سکھائے عشق کے دستور اپنے نغموں سے

صداقت اور محبت کی اُس نے دی تعلیم
اندھیریوں میں بھرا نور اپنے نغموں سے

بنائے طورِ تجلّی سے اپنی بن بن میں
دکھایا جلوۂ مستور اپنے نغموں سے

جو روح غم کی تہوں میں کہیں ملی مغموم
اُسے بھی کر دیا مسرور اپنے نغموں سے

لطافتوں سے کیا ارضِ ہند کو لبریز
کثافتوں کو کیا دُور اپنے نغموں سے

فلک کو یاد ہیں اُس عہدِ پاک کی باتیں
وہ بانسری وہ محبت کی سانولی راتیں

دلوں میں رنگِ محبت کو استوار کیا
سوادِ ہند کو گیتا سے نغمہ زار کیا

جو راز کوششِ نطق و زباں سے کھل نہ سکا
وہ راز اپنی نگاہوں سے آشکار کیا

نقوش ثبت کئے اپنی رہنمائی کے
زمیں کو فیضِ قدم سے فلک وقار کیا

دیا جو درس زمانے کو، بے مثال دیا
کیا جو کام زمانے میں، یادگار کیا

اُداسیوں کو نئی زندگی عطا کر دی
ہر ایک ذرّے کو دل دے کے بے قرار کیا

جو مشربِ اُس کا نہ اِس طرح عام ہو جاتا
جہاں سے محو محبت کا نام ہو جاتا

طلوعِ سیاست

محفل عالم ضیائے حسن سے خالی ہوئی
صبح کی صورت جہنّم کی طرح کالی ہوئی

سہم کر ناروں کی خلوت میں محبت چھپ گئی
وہ صداقت اور وفا کی گود کی پالی ہوئی

دیوِ استعمار نخوت سے ہوا گرمِ خروش
ہر قدم پر روحِ آزادی کی پامالی ہوئی

رات بن کر سطحِ عالم پر سیاست چھا گئی
تیرہ ساماں خلوتوں میں اس کی رکھوالی ہوئی

ساری دنیا کے اُجالوں پر اندھیرا چھا گیا
تھی سیہ کاری کی آخر یہ بنا ڈالی ہوئی

حرص کے بندے بڑھے صبر آزمائی کے لئے
اک عذابِ نو ہوا نازل خدائی کے لئے

رسم و آئینِ محبت پر تباہی آ گئی
صبحِ فطرت کی سپیدی میں سیاہی آ گئی

بھول بیٹھا آدمی سب راستی کے راستے
سر اُٹھاتے ہی ادائے کجکلاہی آ گئی

ذرّۂ ناچیز سورج بن کے اترانے لگا
خاک کے سر میں ہوائے بادشاہی آ گئی

جوشِ نخوت میں سیاست نے کئے ایسے گناہ
تنگ اپنی جان سے خود بے گناہی آ گئی

محفلِ مہر و وفا سے بے خودی رخصت ہوئی خود نمائی صورتِ قہرِ الٰہی آ گئی

مستقل جو عہدِ شخصیت کی لعنت ہو گیا
نام اس دستورِ شخصی کا سیاست ہو گیا

بیسویں صدی بکرمی

اک دور وہ تھا، روح فزا، کیفیت اندوز صبحِ حرم کعبہ تھی بت خانے کا نوروز
تھا برہمن و شیخ میں اک ربطِ مسلسل ناقوس و اذاں کا تھا ہر اک نغمہ دل افروز
اک دور یہ ہے کعبۂ و بتخانہ میں ہے جنگ حالانکہ وہ منصور رہے اس میں نہ یہ فیروز
اعمالِ جنوں خیز سے ہیں ہند کی قومیں پُر شور، غم افروز، شر اندوز، حسد توز
شورش پہ ہے آمادہ شعارِ بتِ خاموش ہو جاتا ہے دنیا میں فساد ایک نیا روز
ہر غنچے میں ہر پھول میں اک نکہتِ مسموم ہر ساز کی آواز میں اک شورِ سکوں سوز
مندر کے مغنی سے خدارا کوئی کہہ دے "لے مرغِ سحر ضبط ز پروانہ بیاموز

کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد"

یاد آیا ہے کہ یہ دنیا محبت خانہ تھی — بارشِ حسن و وفا کاشانہ در کاشانہ تھی
برہم و رنجیدہ چتون میں بھی تھا حسنِ خلوص — سرسری سی اک نظر بھی گرمیٔ افسانہ تھی
آدمی اپنے ہی کیفِ سرخوشی سے مست تھا — میگساری بے نیازِ ساغر و پیمانہ تھی
لعنتِ اغراض سے تھا پاک ذہنِ آدمی — صرفِ تعمیرِ جہاں میں ہمتِ مردانہ تھی
"دیوِ استعمار" بننے پر نہ تھا انساں حریص — "شخصیت" بیداد و استبداد سے بیگانہ تھی
ریت کے ذروں پہ سر جھکتے تھے سجدوں کیلئے — بندگی نا آشنائے کعبہ و بتخانہ تھی

گلشنِ ہستی میں یک رنگی کا عالم عام تھا
پہلے صرف اک قوم تھی "انسان" جس کا نام تھا

رفتہ رفتہ سادگی کے پیرہن بدلے گئے — کچھ نئے پہلو میانِ انجمن بدلے گئے

آدمیت کو پسند آیا درندوں کا لباس
فکر کے تیور، نظر کے بانکپن بدلے گئے

خود پرستی نے بنا ڈالے نئے "جغرافیے"
جنگلوں میں انقلاب آیا، چمن بدلے گئے

کی گئی تقسیم مقبوضات میں سطحِ زمیں
دہر کے نقشے بہ عنوانِ "وطن" بدلے گئے

جن میں پھولوں کی نزاکت تھی، ستاروں کی چمک
وہ محبت کے سب اندازِ کہن بدلے گئے

آگ میں لوہے کو بدلا اور ڈھالے اُس سے تیر
پھر کمانداری سے دلداری کے فن بدلے گئے

سجدہ گاہوں میں تعصب نے نئی تفریق کی
دیر و کعبہ میں عبادت کے چلن بدلے گئے

جادۂ صدق و وفا پر ظلمتیں طاری ہوئیں
کارواں پر خود روی کی لعنتیں طاری ہوئیں

جنگ و خونریزی نشاطِ عشرتِ عالم ہوئی
بربریت سے رگِ انسانیت محرم ہوئی

بہہ گیا انسان ظاہر داریوں کے سیل میں
روح کی قوت بقدرِ مادیت کم ہوئی

نشّہ باقی تھا کہ پیدا ہو گیا کسلِ خمار
سرخوشی کی انتہا سے ابتدائے غم ہوئی

زندگی پر موت کی خاموشیاں چھانے لگیں
دل نوازی ساز کی نغموں کی لَے مدّہم ہوئی

نالۂ نَے نے لگا دی آگ دشت و کوہ میں
آتشِ گل سے پریشاں محفلِ شبنم ہوئی

اختیار و جبر کی خُو آدمی میں آ گئی
غایتِ تخلیق کی معصومیت برہم ہوئی

لی تمدن نے نئے قانون اور آئیں کی آڑ
ظلم کے پردے میں بنیادِ ستم محکم ہوئی

آہ وہ محفل نہ وہ بادہ نہ وہ ساقی رہا
اُس کے ماتم کے لئے "شاعر" کا دل باقی رہا

دینِ فطرت بھی وہی آئینِ فطرت بھی وہی
نور کی رَو بھی وہی، رفتارِ ظلمت بھی وہی

چاند کی کرنوں میں ابتک ہے وہی عالم کشی
سینۂ خورشید میں سوز و تمازت بھی وہی

ہے وہی خاکِ چمن کی ماہیت گُل آفریں
رس وہی غنچوں میں پھولوں میں لطافت بھی وہی

کوہساروں میں بھی پہلا سا وہی ہے ارتفاع
خاک اور افلاک کی پستی و رفعت بھی وہی

ہے مذاقِ خواب سبزے کا اُسی انداز پر
جاگنے کی دیدۂ انجم میں قوت بھی وہی

ہے وہی موجوں میں مستی اور رقصِ آبشار
شمع کا دستور، پروانوں کی عادت بھی وہی

قسمتِ ناز و نیاز ابتک وہی ہو سوز و ساز
عشق میں اور حُسن میں ربط و محبت بھی وہی

کاش یہ تقلید کرتا فطرتِ آزاد کی
زندگی انساں نے اپنے ہاتھ سے برباد کی

ہوشیار اے اہلِ عالم! اب نہیں ہنگامِ خواب
محفلِ ہستی یونہی کب تک اسیرِ انقلاب؟

بربری تہذیب سے، ہنگامۂ تخریب سے
تم نے دنیا کے ہزاروں دَور کر ڈالے خراب

دُور کر سکتی ہے اک انگڑائی اب بھی روح کی
شخصیت کی تشنگی جمہوریت کا اضطراب

پھر نظامِ کہنہ کو پیرایۂ تجدید دو
اپنی دنیا کو بنا لو بزمِ فطرت کا جواب

قومیت، فرقہ پرستی، اور نسلی امتیاز
پیکرِ انسانیت پر اک طرح کا ہیں عذاب

قلعۂ پندار کو مسمار کر دو۔ توڑ دو
چاک کر کے پھینک دو یہ مادیّت کا حجاب

صرف "انسان" بن کر اپنی دنیا میں رہو
پرسکوں، آزاد، یکسو، کامگار و کامیاب

بادۂ کبر و خودی ناپاک ہے ملعون ہے
پی رہے ہو تم جسے انسانیت کا خون ہے

سوزِ ناتمام

مجھے محروم اپنی انجمن سے کر دیا تو نے
بنا کر بوئے گل، رخصت چمن سے کر دیا تو نے

میں شبنم بن کے باغِ قدس میں بسنے کے قابل تھا
فنا کیوں مجھ کو سورج کی کرن سے کر دیا تو نے؟

پریشاں ہو گیا شیرازۂ امن و سکوں میرا
کہ بیگانہ مجھے اپنے وطن سے کر دیا تو نے

جو دل آباد تھا تیرے تعلق کی مسرت سے
اُسے برباد اندوہ و محن سے کر دیا تو نے

رگ و پے میں مرے پہلے تو خود تو نے خودی بھر دی
پھر اُس کا سلسلہ دار و رسن سے کر دیا تو نے

بھلا وہ کیا سبک پرواز ہوتا اصل کی جانب
جسے "رشتہ بپا" گور و کفن سے کر دیا تو نے

جو تکلیفِ سماعت تھی، نوائے بیخودی میری
تو کیوں بیخود مجھے کیفِ سخن سے کر دیا تو نے؟

گوتم بودھؒ

حسن جب افسردہ پھولوں کی طرح پامال تھا
جب محبت کا غلط دنیا میں استعمال تھا

بے خودی کے نام پر جب دورِ جام بادہ تھا
جب تجلیٔ حقیقت سے ہر اک دل سادہ تھا

نفس تھا جب عیش کو رازِ بقا سمجھے ہوئے
جب ہوس تھی صرف "عورت" کو خدا سمجھے ہوئے

زیست کا اور موت کا ادراک دنیا کو نہ تھا
ظلم کا احساس جب بے باک دنیا کو نہ تھا

علم و عرفانِ الٰہی کی شہادت تو نے دی
غور کرنے کی دلِ انساں کو دعوت تو نے دی

بند آنکھیں کر کے اس دنیا کے مکروہات سے
تو نے حاصل کی ضیائے دل تجلیات سے

دے کے تعلیمِ الوہیت زبانِ کفر میں
تو نے مذہب کی بنا ڈالی جہانِ کفر میں

برف زاروں کو ترے انفاس نے گرما دیا
تیرے استغنا نے تختِ سلطنت ٹھکرا دیا

یاد تیری آج بھی ہندوستاں میں تازہ ہے
چین، جاپان اور تبت تک ترا آوازہ ہے

روشنی جس کی نہ ہوگی ماند وہ مشعل ہے تو
سرزمینِ ہند کا "عرفانیٔ اوّل" ہے تو

نشاطِ آغاز و خمارِ انجام

منزلِ ہستی تھی مطلق اک طلسمِ سکر و خواب   اس لئے انساں کو بھیجا تھا یہاں پا در رکاب

نشۂ ہستی میں یہ بدمست ہو کر رہ گیا   ہوش کی دنیا ہوئی آخر شکارِ انقلاب

انقلاب

انقلاب اے کاروانِ اہلِ عالم انقلاب!

کیا تھی دُنیا دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گئی   صبحِ گلشن رفتہ رفتہ شامِ صحرا ہو گئی

عہدِ زرّینِ گذشتہ پر نگاہِ تبصرہ!   دورِ ماضیِ زمانہ پر نگاہِ احتساب!

احتساب

احتساب اے آدم و اے ابنِ آدم احتساب!

میکدہ فطرت کا تھا اک جلوہ گاہِ پُر سرور   ہر روِش پر ہو رہی تھی بارشِ نور و ظہور

رنگ چھڑکا جس نے کیفِ زندگی پر موت کا   روح کو اب تک نہیں اُس بے ہُشی سے اجتناب

اجتناب

اجتناب آسودگانِ خوابِ بیہم اجتناب!

نخوت و نفرت کی زنجیروں کو کر دے پاش پاش   توڑ دے زندانِ باطل، شاد باش آزاد باش

دُور کر "نورِ صداقت" سے دلوں کی تیرگی　　　پھر "محبت" کے مقدّس قصر میں ہو باریاب

باریاب

باریاب اے سطوتِ دنیائے اعظم باریاب!

آہ وہ خلدِ محبت، حُسن کی وہ جلوہ گاہ　　　وہ بہارِ رنگ و بو، وہ عشرتِ شام و پگاہ

وقف تیرے ہی لئے تھا چاند تاروں کا سکوں　　　کیوں ہوا محفل سے دُور اپنی کہ اب ہے اضطراب؟

اضطراب

اضطراب اے قطرۂ لرزانِ شبنم اضطراب!

مدتیں گزریں اسے انوار میں جھولے ہوئے　　　آدمی ہے اب نشاطِ اوّلیں بھولے ہوئے

وہ تجلّی پھر دکھا دے جو دکھائی تھی کبھی　　　جلوہ آرا منظرِ ہستی میں ہو جا بے حجاب

بے حجاب

بے حجاب اے فطرتِ ہمراز و محرم بے حجاب!

پھر وہی امن و سکوں ہو، پھر وہی کیف و نشاط　　　پر توِ صبحِ ازل ہو شمعِ بزمِ انبساط

اے فضائے عالمِ ہستی بدل دے اپنا رنگ　　　اے دعائے ارتقائے دہر ہو جا مستجاب

مستجاب

مستجاب اے التجائے جانِ پُرغم مستجاب!

بساطِ سیاست

عہدِ اوّلی کی سیاست شمعِ خلوت خانہ تھی
مطلقاً اصلاح اور تہذیب سے بیگانہ تھی

جنگ ہوتی تھی مگر حسن و محبت کے لئے
لوٹ دی جاتی تھی دنیا ایک عورت کیلئے

زندگی سے بھی زیادہ تھی ضرورت حسن کی
حکمرانوں کے دلوں پر تھی حکومت حسن کی

سکندر،

مست ہو کر اک نئی انگڑائی لی یونان نے
جنگ کی دیوی کو دیں قربانیاں انسان نے

نغمہ پیرائے حسن تھا تلوار کی جھنکار میں
تھا ترشح حسن کا بھی خون کی بوچھار میں

حسن کی تنویر تہذیبِ سیاست ہو گئی
اس بہانے سے سیاست خوبصورت ہو گئی

قیصرِ روم،

رُوم سے آیا جو اک طوفان رودِ نیل میں
حسنِ یوسفؑ جاگ اٹھا مصر کی تخئیل میں

شورِ قرنا سے کلیجہ پھٹ گیا اجسام کا
صورِ دار و گیر سے چونکا جمود اہرام کا

یہ سیاست کا نیا پیرایۂ تحقیر تھا
حسن بعدِ فتح بھی ناقابلِ تسخیر تھا

رفتہ رفتہ جذبِ عشرت میں سیاست ہو گئی
اور ہی کچھ ہستی و مستی کی حالت ہو گئی

اب نہ مذہب تھا نہ شورِ آذر و اصنام تھا
آدمی تھا اور ہوس باقی خدا کا نام تھا

پھر بچھی ایوانِ عالم میں سیاست کی بساط
جمع آکر ہو گئے اربابِ حزم و احتیاط

جس کو بطحا کے مدبر نے کیا آراستہ
کاروانِ نو کو راس آیا وہی اک راستہ

شمعِ منزل بن گیا وہ ناتِ عالم کا چراغ
جس نے روشن کر دیا جسمِ سیاست کا دماغ

خالد (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

بڑھ چلا طوفان بن کر قافلہ اسلام کا
زلزلے میں آگیا ہر قصر روم و شام کا

غازیٔ ملت نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا
آسماں پر پرچمِ توحید اٹھا کر رکھ دیا

بتکدوں میں نعرۂ "اللہ اکبر" گونج اٹھا
نغمۂ وحدت سے ہر ایوان، ہر گھر گونج اٹھا

صلاح الدین ایوبی،

چند صدیوں میں ہزاروں معرکے سر ہو گئے
ٹوٹ کر دیر و کلیسا سب برابر ہو گئے

ہاتھ میں تلوار تڑپی، خون میں جوش آگیا
بادہ نوشانِ ہوا و کبر کو ہوش آگیا

جذبِ وحدت ہو گیا طوفانِ مواجِ صلیب
یعنی کثرت آگئی پھر اپنے مرکز کے قریب

ضو حقیقت کی، فروغِ آدمیت بن گئی
شمع کی لو صاف انگشتِ شہادت بن گئی

نپولین،

درس جب مردِ عرب سے لے چکا طفلِ عجم
صحنِ مغرب میں بھی جا پہونچے سیاست کے قدم

عزم سے سرشار نکلے عیش کا مانِ فرانس — چبھ گئی اُن کے دلوں میں نازنیں پلکوں کی پھانس
یثربی آئیں کا تابع جو سرافگن ہو گیا — نام اُس کا محفلِ عالم میں روشن ہو گیا

انور پاشا،

جب سیاست گرمِ غداری ہوئی مذہب کے ساتھ — روکنے اس کو اُٹھا غیرت کا اک مضبوط ہاتھ
آخری ہچکی "خلافت" نے جو لی پایانِ کار — روح اُس کی ہو گئی فرطِ الم سے سوگوار
مردِ بیمار ایک تخییل گراں میں کھو گیا — موت یہ سمجھی مرا ٹرکی پہ قبضہ ہو گیا

مصطفٰے کمال پاشا،

آخر اُٹھا اس عزا خانے سے اک عیسیٰ نفس — ہر نظر جس کی دوا ہر سانس جس کی اک جرس
تھا سیاساتِ مغرب میں اُسے حاصل کمال — آگیا اُس کی سمجھ میں جلد درمانِ زوال
اُس نے ثابت کر دیا یہ سب فریبِ کار ہے — تُرک ابھی زندہ ہے، تُرکی قوم ابھی بیدار ہے

مہاتما تلک،

ہند جو تھا عظمتوں کی اک گزرگاہِ قدیم — امتدادِ وقت سے تھا حال اُس کا بھی سقیم
"کرشن" کی جس سرزمیں سے کی گئی صورت گری — "خاکِ گوتم" کی امانت سے جسے تھی برتری
پرچمِ اسلام صدیوں جس پہ لہراتا رہا — آسماں جس کی بلندی کی قسم کھاتا رہا
اب وہی اس دور میں پامالِ استبداد تھی — رہنِ استعمار اُس کی فطرتِ آزاد تھی

آخر اک اللہ کے بندے کو جوش آ ہی گیا
ایک قشقہ بر جبیں، گیسو بدوش آ ہی گیا
شمعِ نو سے صحن بت خانہ تجلّی کوش تھا
خانقاہوں کا چراغ اب بھی مگر خاموش تھا

سی آر داس،

اک نیا احساس آزادی فضا میں جاگ اُٹھا
سحرِ بنگالہ بنارس کی گپھا میں جاگ اُٹھا
کاشی و متھرا کی قوموں میں حرارت آگئی
جانبِ منزل رواں ہونے کی قوت آگئی
سعیٔ آزادی کے چرچے جا بجا ہونے لگے
ملک کی وسعت میں پیدا رہنما ہونے لگے
مسلمِ ہندی اسیرِ خوابِ غفلت تھا ہنوز
اس کی آنکھوں میں وہی کیفِ حکومت تھا ہنوز

لینن،

بزمِ عالم میں سیاست کے یہ طوفاں دیکھ کر
تھی محبت نالہ برلب رنگِ انساں دیکھ کر
جذبۂ الفت سے تھا ناآشنا سرمایہ دار
تھا مساوات اور ہمدردی سے خالی روزگار
شخصیت کے بت، نئے فرعون اور قارون تھے
جس قدر قانون تھے مردود تھے ملعون تھے
وہ مشینیں جن سے کھچتا تھا غریبوں کا لہو!
وہ جہنم جن کو ایندھن کی تھی ہر دم جستجو!
وہ غلط اندیش آقا جن کو تھا سودائے خام
ساری دنیا کو بنا لیں، اپنی خواہش کا غلام!
سرزمینِ روس سے آخر وہ دل پیدا ہوا
جس میں دردِ انسانیت کا مستقل پیدا ہوا
اُس نے پھونکا محشرِ عالم میں صورِ انقلاب
ہوگئی بیدار اُس کے ساز سے دنیائے خواب

بے کسی کے زرد چہرے پر خوشی کا نور تھا
تاجِ شاہی پائمالِ ہمّت مزدور تھا

سعد زاغلول پاشا،

اس نوائے نو سے گونجی سرزمینِ مصر بھی
کہنیوں تک چڑھ کے پہونچی آستینِ مصر بھی

ایک جسمِ حریت، اک پیکرِ ملت نواز
کارواں میں صورتِ یوسفؑ ہوا جلوہ طراز

وہ نہیں آواز اس کی اب بھی عالم گیر ہے
سعیِ آزادی اسی کے خواب کی تعبیر ہے

رضا شاہ پہلوی،

سطوتِ ضحاک و کسریٰ کی دبی چنگاریاں
بزمِ جمشید و فریدوں کی عجوبہ کاریاں

جب پناہِ کجکلاہی میں جواں ہونے لگیں
گرمیاں دوزخ کی جنت سے عیاں ہونے لگیں

ہیش کے بادل جہانِ زندگی پر چھا گئے
سردِ آتش ہو گئی، آتش کدے تھرا گئے

حافظ و سعدی کی قبروں سے اٹھا کالا دھواں
ماتم آگیں، نالہ افشاں، دردبار و نوحہ خواں

رحم آخر آگیا فطرت کو ان حالات پر
اک سحر تاباں ہوئی غم کی اندھیری رات پر

آتشِ افسردہ سے پھر اک شرر پیدا ہوا
نظم اور اصلاح کا پیغامبر پیدا ہوا

صورتِ ابرِ بہار اس سرزمیں پر چھا گیا
سوختہ سامانیوں میں پھر نیا رنگ آ گیا

امان اللہ خاں،

مولدِ بابر پہ تھیں تاریکیاں چھائی ہوئی
غزنوی کی روح تھی ظلمت سے گھبرائی ہوئی

تھی فضاؤں کو جہالت کی گھٹا گھیرے ہوئے — بربریت تھی سیاست کی فضا گھیرے ہوئے

اس فضا سے ایک مہرِ ضوفشاں پیدا ہوا — گردِ منزل سے امیرِ کارواں پیدا ہوا

روشنی علم و عمل کی دور تک پیدا ہوئی — کوہساروں سے تمدن کی چمک پیدا ہوئی

سیر ہمراہِ ثریا کرکے آیا شہریار — مغرب و مشرق سے لایا چند گوہر شاہوار

اُن کی تابش سے نگاہ تنگ بیں گھبرا گئی — نور سے چشمِ قدامت میں چکاچوند آ گئی

سازشیں جہل و قدامت میں ہوئیں اُسکے خلاف — کاوشیں ذہنِ سیاست میں ہوئیں اُسکے خلاف

اس کو بیزارِ وطن، اہلِ وطن نے کر دیا — روح کو اپنی، خود آوارہ چمن نے کر دیا

ملک میں اُس کی نفیرِ عام باقی ہے ہنوز — وہ نہیں ہے لیکن اُس کا کام باقی ہے ہنوز

جب اُفق پر پھر تباہی کی سیاہی چھائے گی — آفتابِ نو بنا کر اس کو فطرت لائے گی

ڈی ویلیرا،

آخر آئرلینڈ بھی گونجا نوائے درد سے — ہو گئی معمور اک دنیا صدائے درد سے

دل نہ تھا آئینہ تدبیر سب کے پاس تھا — سب کو اپنی اپنی آزادی کا اب احساس تھا

ایک ٹھہرے نے جوابِ کجروی کچھ کر دیا — رفتہ رفتہ شاہِ استعمار کو زچ کر دیا

گاندھی

روحِ آزادی نمو پا کر مجسم ہو گئی — حریت کی اک اساسِ تازہ محکم ہو گئی

اک مقدس زندگی سی ہند پر چھانے لگی
"خامشی" سے دیوتاؤں کی صدا آنے لگی
مادیت سے نہ جب تکمیلِ آزادی ہوئی
قوتِ روحانیت، قندیلِ آزادی ہوئی

محمد علی،

دوسری قوموں میں تھا جاگا ہوا اک اضطراب
اور تھا اپنے شبستاں میں مسلماں محوِ خواب
محفلِ مشرق میں چمکا آخر اک خورشیدِ نو
ڈال دی بیداریٔ مُسلم کی اک تمہیدِ نو
دردِ ملت کے تھا معمور اُس کے دل کا ساز
اُس کے ہر آنسو میں تھا اک شعلۂ گرمِ حجاز
وہ قبا بر دوش، دردِ قوم میں ڈوبا ہوا
وہ غلامی کی تہ کاری سے گھبرایا ہوا
جذب گو اُس کو کیا شمعِ کلیسا نے بہت
اپنی جانب اُس کو کھینچا رنگِ دُنیا نے بہت
لیکن اُس کی روح کیفِ خاص سے معمور تھی
جان دے کر زندگی لینی اُسے منظور تھی
وہ ابد تک ہو گیا محوِ جمالِ زندگی
موت میں اُس کی نہفتہ تھا کمالِ زندگی
جینے والوں سے وہ بعدِ موت بھی ممتاز ہے
ساز میں ہر دل کے اُس کی گرمیٔ آواز ہے

حسرت موہانی،

ایک اُس کا ہمنوا اس انجمن میں اور ہے
اک فرشتہ آدمی کے پیرہن میں اور ہے
اُس کے سینے میں بھی ہے اک خونچکاں داغِ وطن
وہ بھی ہے اک طوطیٔ آشفتۂ باغِ وطن
جیل کی تنہائی میں نفس آزمائی اُس نے کی
ہم غلاموں کے لئے سعیِ رہائی اُس نے کی

دل کے ٹکڑے اسکے لب تک نالہ بن کر آئے ہیں
مدتوں چکّی پر آزادی کے نغمے گائے ہیں

آنکھ میں آنسو ہیں، ہونٹوں پر حدیثِ راز ہے
اُس کی ہر آواز گویا دُور کی آواز ہے

ڈھونڈتا ہے دل کی خاکستر میں اک حاصل ہنوز
ہے اسیرِ حسرتِ "آزادیٔ کامل" ہنوز

مسٹر محمد علی جناح،

بمبئی میں اک امیرِ کارواں پیدا ہوا
"ذوالجناحی" دبدبے کا پہلواں پیدا ہوا

اُس کا مستقبل تھا ذہنِ فطرتِ آگاہ میں
پرورش فرمائی مغرب کی سیاست گاہ میں

"قائدِ اعظم" بنا کر ہند میں لائی اُسے
دے دیا اک دلنشیں اندازِ گویائی اُسے

جان ڈالی اُس نے "مسلم لیگ" میں آواز سے
نغمۂ مشرق ہوا بیدار غربی ساز سے

اپنے اک ہمنام کا ہے جانشینِ ارجمند
آج اسلامی سیاست کا ہے اُس سے سر بلند

حکمتِ خالق کی اس کی ذات سے تحدیث ہے
حامیٔ توحید اک پروردۂ تثلیث ہے

گھر بنا دستِ خلیل اللہ سے ایمان کا
یہ خلیلِ ہند ہے معمار "پاکستان" کا

سروجنی نائیڈو،

زہرۂ ارضِ دکن، وہ بلبلِ ہندوستاں
سامنے جس کے ہے مردِ مغربی الکن زباں

شاعرہ، شعرِ مجسّم، صاحبِ فکر و خیال
مقتدر خاتون، مردوں میں نہیں جس کی مثال

درد دل میں، فکر میں قوت، گرج آواز میں
حوصلوں میں زندگی، مردانہ پن انداز میں

جس کا مقصد صرف آزادیٔ دیارِ ہند کی
زندہ اک دیوی ہے وہ اصنام زارِ ہند کی

کیوں نہ پُر امید ہو مستقبلِ ہندوستاں
عورتیں بھی ماہرِ علمِ سیاست ہیں یہاں

مسیح الملک حکیم اجمل خاں،

خاکِ دہلی سے ہوا پیدا وہ عیسیٰؑ مرتبت
جس کی حکمت نے بدل ڈالا مزاجِ قومیت

اک نظر میں نبض جس نے وقت کی پہچان لی
مُقبلانِ عہد نے جس کی حذاقت مان لی

قوم کا بگڑا ہوا تھا ایک مدت سے قِوام
نسخۂ اصلاح سے اُس کے بنا آخر یہ کام

دیکھ کر قومی فضا میں فائزِ تنظیم اُسے
ملک نے اپنا "مسیحا" کرلیا تسلیم اُسے

زندہ داہِ ہستیٔ اقوام زندہ ہے ابھی
مشرقِ اقصیٰ میں اس کا نام زندہ ہو ابھی

ڈاکٹر انصاری،

وقت اک ایسا بھی آیا قوم کے اقبال کا
ہو گئے تقدیر سے لقمان و عیسیٰ ایک جا

چارہ سازی بر طریقِ معتبر دونوں نے کی
قوم کی خدمت حکیم اور ڈاکٹر دونوں نے کی

"مجلسِ اقوام" کا دمساز جب کوئی نہ تھا
"نحنُ انصار" کی اس کے ساز سے آئی صدا

عرصۂ مجد و سیاست کا وہ غازی مرد تھا
ہاتھ میں اس کے شفا تھی، دل میں اُس کے درد تھا

اب بھی اس کی روح کو ملت سے رسم و راہ ہے
اب بھی اُس کے قصر میں اُردو کی صحت گاہ ہے

ابوالکلام آزاد،

ہند نے اک اور دُرِّ بے بہا پیدا کیا | اک سمندر علم و حلم و فضل کا پیدا کیا
وہ مُفسِّر، وہ مُدبِّر، وہ امام المسلمیں | قائد و شاعر، ادیب و نکتہ سنجِ بہتریں
صاحبِ طرز و مفکّر، بے مثال و باکمال | یادگار اُس کی ہیں باقی "البلاغ" و "الہلال"
جس کی تقریروں نے بام و در ہلا کر رکھ دیے | جس کی تحریروں نے دل اکثر ہلا کر رکھ دیے
شاہبازِ وقت جب اس پر گرا پر تول کر | لے گئی اک مادّی قوت یہ موتی رول کر
مرجعِ اُمّید اس کی ذاتِ عالی اب بھی ہے | مجلسِ ملّت میں کُرسی اس کی خالی اب بھی ہے
انقلابِ وقت اس کو کھینچ کر پھر لائے گا | یہ مقامِ اوّلیں پر اپنے واپس آئے گا
اور کچھ دن تک اسیرِ غلبۂ افراد ہے | اس کی پابندی نہیں ممکن کہ یہ آزاد ہے

ظفر علی خاں،

ایک قائد اور اُٹھا خطۂ پنجاب سے | ناخدا پیدا ہوا اقوام کے گرداب سے
بے تکلف بولنے والا ادائے خاص ہیں | اپنے شہپر تولنے والا فضائے خاص ہیں
وہ اسیرِ درد آزادی کی تدبیروں کے ساتھ | عمر آدھی کاٹ دی زنداں میں زنجیروں کے ساتھ
اصفہانی تیغ ہے جس کا قلم، ایسا ادیب | رُوح و دل پر ہو نصب جسکا علَم، وہ خوش نصیب
وہ دبیرِ ملک، احیائے صحافت جس سے ہو | وہ مُدبّر، نظم و تہذیبِ سیاست جس سے ہو

دَورِ آزادی کی جب تسوید کا وقت آئے گا | نام اس کا بھی جلی حرفوں میں لکھا جائے گا

جواہر لال نہرو،

تھک گیا راہِ طلب میں چلتے چلتے کارواں | وقت بولا "ہے ابھی تحریکِ آزادی جواں"
شمعِ منزل تھی بقدرِ سوز، پروانہ طلب | تھا ابھی دشتِ جنوں افروز، دیوانہ طلب
کارواں واماندگی سے جب نظر آیا خموش | آگیا "لبیک" کہہ کر اک جوانِ سرفروش
روحِ آزادی جوانانِ وطن میں پھونک دی | آگ اس کے سوز نے صحنِ چمن میں پھونک دی

منتظر بیٹھی ہے آزادی کسی کی راہ میں
انتظارِ شاطرِ فطرت ہے بازی گاہ میں

اے نویدِ منتظر ویرانیٔ محفل میں آ | شمعِ منزل بن کے ظلمت خانۂ منزل میں آ
اے امیرِ کارواں، اے دستگیرِ کارواں | اے سکونِ کارواں، ہنگامۂ مشکل میں آ
مشکل و آساں، جو چاہے کر وہ منزل اختیار | شورشِ طوفاں میں آ، یا دامنِ ساحل میں آ
آج تیری سیرگاہوں میں ہے شیطاں باریاب | روح میں تشریف فرما ہو۔ حریمِ دل میں آ
دُور پہونچیں ظلم اور انصاف کی آویزشیں | فیصلہ کر لے کو اس جنگِ حق و باطل میں آ
دے ہمیں منزل کی رفعت سے پیامِ صبحِ نو | جلوۂ اُمید بن، تصویرِ مستقبل میں آ
زد سیاست راہِ ما، از کوششِ بے سودِ ما | در جمالِ خویش بنما منزلِ مقصودِ ما

رسولِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ

مسلط بزمِ عالم پر ہوئی یوں تیرہ سامانی
کہ تھی جگنو سے بھی کمزور سورج کی درخشانی

چمن کے رنگ سے تھا اہتمامِ اخذِ بے رنگی
سحر کے نور سے تھا انتظامِ ظلمت افشانی

سیاست کی گھٹا میں کوندتی تھی برقِ خود رائی
حکومت کی ہوا میں مست تھی تخئیلِ انسانی

جسے انساں نے سینچا تھا خونِ گرمِ انساں سے
وہ کھیتی ہر فضا میں کر رہی تھی شعلہ افشانی

شکنجہ جور و استبداد کا تھا اور دنیا تھی
کہیں فخرِ جہاں داری کہیں فرِ جہانبانی

سیاست تھی خدا یعنی سیاست کی خدائی تھی
خودی نے محو کر دی تھی خدا فہمی، خدا دانی

منات و لات کے قدموں پہ تھے سجدے قبائل کے
فجور و فسق سے معمور تھا یہ عالمِ فانی

غرور و کبر میں تحلیل ہستی ہوتی جاتی تھی
یہ دنیا صرف شیطانوں کی بستی ہوتی جاتی تھی

مدبر، خاکِ بطحا نے کیا آخر نیا پیدا
سیاست میں بھی جس نے کی محبت کی ادا پیدا

اُدھر باطل کی ظلمت اور حقیقت کی ضیا پوشی
اِدھر اس کی تجلی میں، خودی پنہاں خدا پیدا

اصولِ نو پہ قائم کی اساسِ زندگی اس نے
عروجِ روحِ انساں کے لئے کر دی فضا پیدا

غلاموں کو دیا دل کھول کر پیغام آزادی — کیا تہذیبِ اعرابی میں رنگِ ارتقا پیدا
عرب سے تا عجم وحدت کا سکہ کر دیا جاری — نیا تبخانے کے ماحول سے کعبہ کیا پیدا
سیاست کو کیا مذہب کے تابع اپنی قوت سے — مذاقِ سجدہ، سرافرازیوں میں کر دیا پیدا
تمدن کو کیا آراستہ تہذیبِ کامل سے — تدبر سے کیا دُنیا و دیں میں رابطہ پیدا

ان الہامی مساعی کا بالآخر یہ نتیجا تھا
کہ جو قانونِ فطرت تھا وُہی قانونِ دُنیا تھا

سلام اے صبحِ کعبہ، السلام اے شامِ تبخانہ! — تو چمکا بزمِ آذر میں بہ اندازِ خلیلانہ
حریمِ پاک تیرا وہ بلند ایوانِ حقیقت کا — جہاں جبریلؑ بھی ناچیز سا ہے ایک پروانہ
کہیں تُو زندگی پیرا بہ اندازِ لبِ عیسیٰؑ — کہیں تو خطبہ فرما، اوجِ طائف پر کلیمانہ
فروغِ آفرینش ہی تو ہے تیرے ہی جلووں سے — کہیں تو شمعِ محفل ہے کہیں تو نور کا شانہ
کچھ اس انداز سے جلوہ نمائی تو نے فرمائی — کہ ہر ذرہ زمیں کا ہوگیا تیرا ہی دیوانہ
یہ دُنیا تیری نظروں میں مثالِ نقطۂ ناقص — یہ عالم خرمنِ عرفاں کا تیرے صرف اک دانہ
مجھے معلوم ہے رازِ غلامی اہلِ عالم کا — ہے آئینِ سیاست سے ترے ذہن ان کا بیگانہ

اگر پیرو ترا یہ عالمِ ایجاد ہو جائے
تو اک انساں ہی کیا، کُل کائنات آزاد ہو جائے

فردوسِ گمشدہ

ایک اندھیری رات میں انسان ہے مصروفِ جنگ / شہرتِ باطل کا بھوکا، تشنۂ کامِ نام و ننگ

کند تلواریں تکبّر کی نیامِ فکر میں / ترکشِ تخئیل میں کمزور جذبوں کے خدنگ

ہے صدائے دشنۂ و نشتر سرودِ ارتقا / موت کی ہر چیخ ہے اس کے لیے آوازِ چنگ

خون کے چھینٹوں کو سمجھا ہے بہارِ گل فروش / مزبلہ اس کو نظر آتا ہے، بزمِ آب و رنگ

جتنے معمورے ہیں، ویرانے ہیں اُن سے بھی سوا / باوجود ان وسعتوں کے، کائنات اس پر ہے تنگ

اتنی ہی مخلوقِ فطرت اور اگر پیدا کرے / سب سما سکتی ہے اس دُنیا میں بے ریب و درنگ

طبقۂ محدودِ انساں، وہ بھی مجبورِ فنا! / سہہ رہا ہے وحشتِ تعمیر میں پاداشِ سنگ

معنئ "انسانیت" بھولا ہوا ہے "آدمی" / کارواں در کارواں ہے "قومیت" کا عذرِ لنگ

ہیبت افزا اب ہے دنیا کی وہ روحانی فضا / جو فرشتوں کی نظر تھی، اور حوروں کی امنگ

اس کو جنگِ زرگری سے شرم کیوں آتی نہیں؟

محفلِ فطرت پہ کیوں اس کی نظر جاتی نہیں؟

عالمِ ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے
اختلافِ رنگ و بُو سے انجمن آباد ہے

باغ میں لالہ بھی ہے گُل بھی سمن بھی، خار بھی
خامشی سب کے لئے مُہرِ لبِ فریاد ہے

ضد نہیں آپس میں ان کو، باوجودِ اختلاف
جانتے ہیں سب نظامِ دہر بے بنیاد ہے

رکھ لئے ہیں نام پھولوں کے ہمیں نے مختلف
فطرتِ گلشن مگر اس قید سے آزاد ہے

ہے مذاقِ متّحد، کثرت میں وحدت کا ثبوت
کوئی ظالم ہے نہ کوئی شاکیٔ بیداد ہے

ان کے باطن کا کوئی انسان محرم ہی نہیں
آشنائے راز صرف اک بلبلِ ناشاد ہے

نغمۂ بلبل سے ہے رسوائیِ رازِ بہار
یوں اسیرِ کاہشِ اندیشۂ صیاد ہے

گلستاں کا ہر ورق ہے، درسِ بیداری ہنوز
لیکن انسانِ تغافل کیش خود برباد ہے

حُسن تھا، روحِ صداقت تھی، محبت تھی جہاں
مجھ کو وہ "فردوسِ گم گشتہ"، ابھی تک یاد ہے

جذبۂ حُسن و محبّت پھر بڑھانا چاہیئے
اس جہنّم زار کو جنّت بنانا چاہیئے

آزادی

وہ اک حورِ مجسم، صد بہار و صد چمن در بر
نشاطِ دو جہاں بر در، حیاتِ انجمن در بر

وہ کالے کالے لمبے بال، پیچ و خم سے بیگانہ
نشیلی انکھڑیاں اُس کی مذاقِ رم سے بیگانہ

نگاہیں آسماں کی رفعتوں پر جھومنے والی
جبینِ صاف، معراجِ افق کو چومنے والی

خلش گل کی جگر میں، اور دل میں درد لالے کا
ادھر اک ہاتھ میں مسجد، اُدھر گنبد شوالے کا

زباں پر نغمۂ ناقوس سے تنویر کی موجیں
لبِ خوش رنگ پر مچلی ہوئی تکبیر کی موجیں

ہمالہ کی پری، اور طور کا اک جلوۂ رعنا
جو اُس کی اک نظر زمزم، تو اس کی اک نظر گنگا

غریبوں اور مزدوروں سے ہنس کر بولنے والی
یتیموں اور بیواؤں کے عُقدے کھولنے والی

مساوات و رواداری کے جذبے پاک چتون میں
وفاداری و دلداری کے جلوے چلبلے پن میں

فضا کی وسعتوں میں اُڑنے والی اک ردا سر پر
ادائیں تیرنے والی ہواؤں کے سمندر پر

تعصب اور نفرت کے لہو سے دست و پا رنگیں
وفا کے رنگ سے ہر عشوہ رنگیں، ہر ادا رنگیں

تنفُّس میں نجات اس کے ترنّم میں حیات اُس کی
تکلّم گلستاں اس کا، جلو میں کائنات اُس کے

تبسُّم سے نمایاں، رنگ اخلاص و محبّت کا
شگفتہ تیوروں میں موجزن دریا صداقت کا

سکوں کی جلتیں آسودہ، فردوسی اشاروں میں
بہارا فروز پھولوں میں، صباحت ریزتاروں میں

زمین و آسماں اُس کے حریم ناز کے آنگن
مہ و خورشید سے اُس کی بساطِ انجمن روشن

چمن اُس کے، بیاباں اُس کے، کوہ و آبشار اُس کے
سمندر اُس کے، میداں اُس کے، امصار و دیار اُس کے

وہ فطرت سے براہِ راست رشتہ جوڑنے والی
غلامی اُس کے پائے ناز پر دم توڑنے والی

وہ شہزادی ہے، میں اُس کی محبت کا بھکاری ہوں
وہ آزادی کی دیوی اور میں اُس کا پجاری ہوں

میرا وطن

جہانِ نور بنا ہے، مرے وطن کے اُفق سے ‏ ‏ طلوعِ رنگِ ضیا ہے مرے وطن کے اُفق سے

ہے آفتاب کا مولد، سوادِ میرے وطن کا ‏ ‏ فروغِ جلوہ نما ہے مرے وطن کے اُفق سے

نظر اُفق پہ جو پہونچی تو میں نے رات کو دیکھا ‏ ‏ کہ چاند جھانک رہا ہے، مرے وطن کے اُفق سے

گھٹائیں جھوم کے آتی ہیں صرف میرے وطن میں ‏ ‏ نزولِ آبِ بقا ہے، مرے وطن کے اُفق سے

ہے اک احاطۂ فطرت فصیل میرے وطن کی ‏ ‏ فسانہ ریز فضا ہے، مرے وطن کے اُفق سے

یہیں نمودِ سحر ہے، وجودِ شام یہیں ہے
غرض فرائضِ فطرت کا اہتمام یہیں ہے

دمِ سفر مگر اک شعبدہ نیا نظر آیا ‏ ‏ نہ آفتاب نہ مہتاب دوسرا نظر آیا

جہاں گیا وہیں فطرت کو ایک رنگ میں دیکھا ‏ ‏ وُہی سحر وُہی اندازِ شام کا نظر آیا

تجلیاں وُہی مشرق میں نورِ مہر کی دیکھیں ‏ ‏ وُہی اُفق میں مجھے چاند ڈوبتا نظر آیا

وُہی ستارے نظر آئے آسماں پہ فروزاں ‏ ‏ وُہی گھٹاؤں میں شعلہ سا کوندتا نظر آیا

بڑھا میں جتنا، بڑھی اُتنی ہی یہ محفلِ فطرت　　جدھر گیا میں اُدھر ہی یہ ماجرا نظر آیا

جو اہتمام کسی اپنی رہگزار میں دیکھا
وُہی نظام ہر اک شہر ہر دیار میں دیکھا

کھُلا یہ راز، ہیں باطل قیود میرے وطن کی　　ہیں بے نیازِ تعیُّن حدود میرے وطن کی
جہانِ فکر سے باہر مرے وطن کی حدیں ہیں　　نہیں اسیرِ نظر ہست و بود میرے وطن کی
سمک سے تا بہ سما ہے مرے وطن کی تجلی　　ثرٰی سے تا بہ ثریا، نمود میرے وطن کی
یہ شش جہات ہیں میرے وطن کا تکیۂ پہلو　　جبیں ہے عرش پہ صرفِ سجود میرے وطن کی
مشاہدے کے لئے چاہئے نگاہ میں وسعت　　بہت وسیع ہے بزمِ شہود میرے وطن کی

زمین میرا وطن، آسمان میرا وطن ہے
یہ فیصلہ ہے کہ "سارا جہان میرا وطن ہے"

منادی

(اسلامیانِ ہند کی جامعِ اعظم (علیگڈھ) کے ماحول ہیں)

حجاب اُٹھے ہوئے ہیں حُسنِ معنی آشکارا ہے
دیارِ سامری جلوہ نمائے طُور و مُوسٰی ہے

اساسِ ارتقا پر ہے جہاں آج آسماں قائم
یہاں ویرانیاں تھیں دیکھنے والوں نے دیکھا ہے

چمک اُٹھے ہیں وہ ذرّے جو کل تھے گرد میں پنہاں
وہ عالم خواب کا ساتھا یہ بیداری کی دُنیا ہے

نہالِ آرزو کو نخلِ طوبیٰ دیکھنے والو
جسے لائے تھے بہرِ آشیاں ہم، یہ وہ تنکا ہے

طلوعِ لالہ و گل ہے زمینِ شورِ فطرت سے
جہانِ زنگ ذرّوں کی رگوں سے پھوٹ نکلا ہے

وہ آنسو جو دعا کے ساتھ طوفاں خیز نکلا تھا،
وقارِ موجِ گنگا، آبروئے رودِ جمنا ہے

جمودِ قومیت میں جس نے کر دی زندگی پیدا
فنا ہو کر فضائے روح میں اب تک وہ زندہ ہے

ہزاراں کیف می ریزد ز روحِ خود بجانِ ما
مشیر و سیّد[1] و سالار و میرِ کاروانِ ما

ترقی کی ہوائیں چل رہی ہیں بزمِ فانی میں
بڑھا لے عنصرِ باقی مزاجِ زندگانی میں

---

[1] مُراد از سرسید علیہ الرحمۃ

جنھیں تعمیرِ قومیّت میں آتا ہے فنا ہونا
مدارج کچھ انھیں ملتے ہیں عمرِ جاودانی میں

سحر کے بعد بھی عنوان اکثر یاد ہیں ہمکو
بڑی افسردگی تھی آخرِ شب کی کہانی میں

جہالت کی وہ عالمگیر خود رائی و خود فہمی
سیاست کی وہ دار و گیر سعئ خونفشانی میں

نظر آتا وہ ہر منظر میں اک آشوب کا عالم
اُبھر آنا وہ شخصی قوتوں کا حکمرانی میں

وہ سب اغلاطِ شب پر پردۂ جہل و تغافل تھیں
مگر اب آچکی ہے صبح جوشِ ضوچکانی میں

بھلا دے یادِ ماضی اور کیفِ حال پیدا کر
کہ مستقبل ہے تیرا جلوہ گر تیری جوانی میں

بسانِ آفتاب از پردہ ہائے ابر بیروں شو
ز قطرہ بگزر از سیلاب و طغیاں بحر و جیحوں شو

دکھا دے پھر زمانے کو کہ تو اصلاً حجازی ہے
جسے کہتے ہیں غفلت تیری شانِ بے نیازی ہے

چٹانوں پر ابھی تکبیر کی آواز ہے کندہ
پہاڑ اب تک لرز جاتے ہیں تجھ سے تو وہ غازی ہے

تری فطرت میں ہے قدوسیت ذاتِ الٰہی کی
گنہگاری بھی تیری اک طرح کی پاکبازی ہے

جلالِ شہریاری ہے ابھی تیرے تجمل میں
ابھی تیرے تخیل میں کمالِ فخرِ رازی ہے

عمل ہے فرض تیرا پھر مآلِ کار جو کچھ ہو
وہ کوئی اور ہے جو ذمہ دارِ کارسازی ہے

ٹھہر بھی راہِ جدّ و جہد میں لیکن کمر بستہ
خیال اتنا رہے تجھ کو کہ ہر وقفہ مجازی ہے

بھلا کر زحمتِ واماندگی پھر مستعد ہو جا
کہ دنیا دوست بن کر مائلِ غربت نوازی ہے

دریں ہنگامۂ شور و شورِ سازِ محفلے دیگر
پسِ ایں منزلِ پیداست پنہاں منزلے دیگر

رہِ سعی و طلب کی وسعتوں میں رائیگاں ہو جا — مثالِ سبزہ پھر نیرنگِ صحنِ گلستاں ہو جا
بنا علم و عمل کو کارواں اور جادہ پیما ہو — غبارِ کارواں کب تک، امیرِ کارواں ہو جا
ثبوت اس دور میں دے اپنی فطرت کی بلندی کا — زمیں گردِ کدورت جب اُڑائے آسماں ہو جا
نگاہِ اہلِ عالم خود ترے جذبات کو پڑھ لے — جب آئے سامنے کوئی، سراپا داستاں ہو جا
خموشی و سماعت دونوں بہتر ہیں تکلم سے — چھپا لے راز اپنا، ہو سکے تو رازداں ہو جا
یہ ہیں آدابِ منزل جن سے ابتک تو نہ واقف تھا — سروشِ غیب کی آواز آئی شادماں ہو جا
شبستانِ منزلِ مقصود کا دیتی ہے پروانہ — تو یہ پروانہ لے اور شب کے پردے میں رواں ہو جا

ز منزل آشنا کن قوتِ فکر و تخیل را
"خدا خود میرِ سامان است اربابِ توکل را"

الٰہی جذبِ کاہیدہ کو ذوقِ بیقراری دے — شکستِ عزمِ ملت کو مجالِ استواری دے
عمل کی سست رفتاری کو پھر بجلی عطا فرما — دلِ مجبور کو پھر ہمتِ خود اختیاری دے
سوادِ خاطرِ محزوں سے ویرانی جھلکتی ہے — دلِ پژمردہ کو پھر مژدۂ فصلِ بہاری دے
بہت کمزور ہے نشو و نمائے جسمِ قومیت — ہوائے باغِ ملت کو مذاقِ سازگاری دے

مٹانا ہے تو پہونچا کر مٹا عرشِ ترقی پر
فلک جس کی زمیں ہو وہ عروجِ خاکساری دے

دلِ ناواقفِ انجام گھبرایا ہوا سا ہے
عروسِ آگہی کو اضطرابِ ہمکناری دے

نظامِ ہستیِ مسلم بدل دے پھر نئے سر سے
قلم کو لوح پر پھر زحمتِ قسمت نگاری دے

چناں در گلشنِ ملّت بہارِ اوّلیں آید
کہ از ہر غنچہ و گُل بوئے فردوسِ بریں آید

طرازِ نیاز

نوائے درد سے معمور ہے مرا آہنگ
تلاش کر نہ مسرت مرے فسانوں میں

شکستِ روح سے جب ٹوٹ جائے سازِ حیات
تو جان آئے کہاں سے شکستہ جانوں میں

قریب ختم ہے سوز و گداز کا قصہ
ہو لطفِ آخرِ شب، میری داستانوں میں

خرابِ صبح ہیں سامان میری محفل کے
خمار بن کے ہوں کچھ دم کے میہمانوں میں

یہ مُشتِ خاک ہو پھر طالبِ صعود و عروج
الٰہی کوئی زمیں بھی ہے آسمانوں میں؟

مجھے عطا ہو نیا ایک جرعۂ تخلیق
جمودِ زیست سے اب ہوں میں سرگرانوں میں

دروںِ خاک سے پھر گُل طراز کر مجھ کو
نیاز مند ہوں، شایانِ ناز کر مجھ کو

مجلسِ وطنی

وہ غمّازِ چمن، افشا کیا رازِ چمن جس نے
دُہی سازِ چمن، کی گرم آوازِ چمن جس نے

وہ آوازِ چمن، جو پھوٹ نکلی غنچۂ دل سے
نئے نغموں سے آخر بھر دیا سازِ چمن جس نے

وہ جانبازِ چمن جس نے صلائے سرفروشی دی
سجا دی خونِ دل سے محفلِ نازِ چمن جس نے

وہ ہمرازِ چمن، جس نے نظامِ نو کیا پیدا
بِنائے آشیاں رکھی بہ اندازِ چمن جس نے

وہ دمسازِ چمن، وہ شہپرِ احساسِ آزادی
اسیری میں دکھا دی شانِ پروازِ چمن جس نے

وہ پروازِ چمن، جوہر ہے جو آئینۂ گُل کا
نمایاں کر دیا ہر نقشِ ممتازِ چمن جس نے

وہ اعجازِ چمن پستی کو جس نے رفعتیں دیدیں
کیا پامال سبزے کو سرافرازِ چمن جس نے

وہ مینائے کہن میں تازگی لائی نئی بھر کر
لگا دی آگ سی افسردگی میں زندگی بھر کر

یہ گرد آلودیِ آئینۂ صبحِ وطن کب تک؟
گوارا اضطرابِ نسترن و نسترن کب تک؟

خلافِ باغباں اہلِ چمن نے ایک سازش کی
کہ ہم تاراج دیکھیں گے یونہی اپنا چمن کب تک؟

اُٹھا اک شور اے روحِ گلستاں لوٹنے والو
بنے گا پھول کے دامن سے گلچیں کا کفن کب تک؟

ہوئی اک مجلسِ شوریٰ مرتب نغمہ سنجوں کی — کہ آخر ماتمِ بے ربطیٔ سازِ کہن کب تک؟
ستارے اسکے بام و در پر اب بھی جھلملاتے ہیں — مگر یہ آگ برسے گی درونِ انجمن کب تک؟
اسیرانِ چمن آخر نہ لیں گے کب تک انگڑائی — نہ ہوگا دل میں آزادی کا طوفاں موجزن کب تک؟
یہ جذبہ لیکے نکلے چوڑیاں تھیں جنکے ہاتھوں میں — کہ اب اندیشۂ ہنگامۂ دار و رسن کب تک؟

کوئی پیغامِ منزل دے امیرِ کارواں بنکر
خدا وہ دن کرے ناقوس بھی گونجے اذاں بنکر

ہوا اعلان ہر اک شاخ پر سر کی ضرورت ہے — بجائے غنچۂ و گل دیدۂ تر کی ضرورت ہے
ہے پیمانے میں دل کے بادۂ خونِ جگر کافی — نہ ساقی کی ضرورت ہے نہ ساغر کی ضرورت ہے
وہ پھانسیں جذب کرلیں دل نے جن سے درد پیدا تھا — رگِ جاں کیلئے اک اور نشتر کی ضرورت ہے
سرود و نغمہ سے غفلت کی آنکھیں کھل نہیں سکتیں — ہماری خوابگہ میں صورِ محشر کی ضرورت ہے
اُٹھادی جائیں یہ پھولوں کی سیجیں مخملی تکیے — ہمارے واسطے کانٹوں کے بستر کی ضرورت ہے
لبِ خاموش پر اک نالہ ہو دل چیرنے والا — نہ پیکاں کی ضرورت ہے نہ خنجر کی ضرورت ہے
ہمارا ہر نفس ہو ترجمانِ گرمیٔ محفل — ہماری ہر ضرورت، انجمن بھر کی ضرورت ہے

بڑھے جائیں یونہی کہدے کوئی یارانِ محفل سے
صدا "لبیک" کی آنے لگی ہے صبحِ منزل سے

عیدِ آزادی کی یاد

آہ پھر غم آفریں ہے رخصتِ ماہِ صیام
عید کا پھر سامنے میرے لیا جاتا ہے نام

پھر مرے احساس کا لیتی ہے دنیا امتحاں
پھر مجھے کرنا پڑا ہے ضبطِ نو کا اہتمام

فاقہ و افلاس کا روزوں نے پردہ رکھ لیا
ورنہ اب اِس قوم کی قسمت میں ہے صومِ مدام

دل ہے مردہ، چہرہ آزردہ، فسردہ چتونیں
جب یہ حالت ہو تو کیسی عید کس کا احتشام

نوحۂ بیوہ، غمِ مزدور، فریادِ یتیم
عشرتِ رفتہ کا یہ سب لے رہے ہیں انتقام

ہے لباسِ نو بدن پر، اور باطن ہے اُداس
کیا اِسی کا نام ہے کامل خوشی، عیشِ تمام؟

قوم ہے محتاج بھی، مجبور بھی، مغموم بھی
عید کا آنا ہے برحق، کیا کریں لیکن غلام؟

فرصتِ شادی دریں ہنگامہ زیبا نیست
نالۂ غم عرضہ کن، وقتِ مبارکباد نیست

وہ حقیقی عید، جس کے تھے کبھی عادی، کہاں؟
اب نصیبوں میں ہمارے عیشِ بنیادی کہاں؟

ہم وہیں ہیں، کر چکے گو طے ہزاروں منزلیں
دیکھئے ہو ختم اپنا دورِ بربادی کہاں؟

دلفگاروں کو نہیں کچھ کام نائے و نوش سے
مشربِ قیصر کہاں؟ آئینِ سجّادی کہاں؟

مسکرا ہی لیں کبھی، گر ہو رہائی کا یقیں
ہم نشیں، ہم تو جنم قیدی ہیں میعادی کہاں؟

ہر نفس اک آفتِ تازہ کا لاتا ہے پیام
خاطرِ ناشادماں کو فرصتِ شادی کہاں؟

جس کا ہلکا سا تبسّم نورِ صبحِ عید تھا
آہ اب آسودگی کی ہے وہ شہزادی کہاں؟

دل غلام، آہیں غلام، آنکھیں غلام، آنسو غلام
ہے غلامی ہی غلامی، دورِ آزادی کہاں؟

یاس انگیز است رنگِ شامِ ناشادیِ ما
دُور و مستور است صبحِ عیدِ آزادیِ ما

ہولی کی تقریب میں نظم لکھنے کی فرمائش پر

آگ بھی ہو لگی ہوئی، دل میں گداز ہی نہیں
شمعِ حیات کا کوئی سوز نواز ہی نہیں

جاذبِ کیف دنو رہے شدۃِ التہابِ روح
رنگ و عبیر سے جبیں لالہ طراز ہی نہیں

اب تو سرِ نیاز ہے اور سجودِ رائیگاں
ناز کسی پہ کیا کروں، موقعِ ناز ہی نہیں

خلوتِ غم اُداس ہے، مطربِ خوش نوا خموش
نغمہ بھی ہے خفا خفا، سوگ میں ساز ہی نہیں

آہیں سناؤں دل کی بات، ختم ہو فکرِ احتیاط
شورشِ تنگنائے دل اب کوئی راز ہی نہیں

آتشِ غم محیط باد، از دو جہاں فراغ شد
دل ہمہ شعلہ شد، تن ہمہ داغ داغ شد

انقلابِ رُوس

تصویرِ حیات کے تین رُخ

جب ہستی کے طوفانوں میں اک قطرہ غوطے کھاتا ہے
آہستہ آہستہ آخر جذبِ طوفاں ہو جاتا ہے
ادبار کے بادل گھرتے ہیں، انکار کی فوجیں اُٹھتی ہیں
دریا کے تیز تھپیڑوں سے عبرت کی موجیں اُٹھتی ہیں
یوں رزمستانِ عالم میں تکمیلِ حوادث ہوتی ہے
شورش کی فراوانی امن و تسکیں کا باعث ہوتی ہے
کہتے ہیں جسے ہستی وہ اک ترکیبِ عروج و پستی ہے
ہر بستی اک ویرانہ ہے۔ ہر ویرانہ اک بستی ہے
ہر آبادی کچھ ذرّاتِ رخشاں کا اک مجموعہ ہے
ہر کانِ گُہر کچھ قطراتِ نیساں کا اک مجموعہ ہے

پھولوں کی رگ رگ میں خوشبو بنتی ہے مٹی گلشن کی
نیلاہٹ پژمردہ کلیوں کی، رنگینی ہے سوسن کی
دُنیا کے گردش خانے میں سو رنگ بدلنے پڑتے ہیں
انسان کھلونے ہیں کچّے، بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں
آغاز پہ سب کی نظریں ہیں، انجام مگر معلوم نہیں
روشن ہے شمع اندھیرے میں، اندازِ سحر معلوم نہیں
سورج تن تن کر نکلا تھا جو کرنوں کی تابانی میں
اُس کی تدفین ہوئی آخر تاریکی کی طغیانی میں
نکلا تھا پھول حجابوں سے پریوں کا گھوارہ بن کر
آخر اک دن پامال ہوا، خاشاکِ آوارہ بن کر
جو چاند ابھی لیلےٰ کی طرح محمل سے اُفق کے پیدا تھا
جب صبح ہوئی تو رنگ اُس کا بیدِ مجنوں سے پھیکا تھا
یہ فطرت کی اک عادت ہے جو اُبھریگا، گر جائیگا
شعلے کی طرح جو لپکے گا، اُس پر پانی پھر جائیگا
وہ روس کا شاہنشاہ، جسے دُنیا گھوارۂ جنّت تھی

پا بوس حکومت تھی جس کی جس کی ٹھوکر میں دولت تھی
انبوہِ علائق میں جس کو یکسوئی پوری حاصل تھی
راحت کے اتنے ساماں تھے تنظیم بھی جن کی مشکل تھی
تختِ عظمت پر بیٹھا تھا، ماحول کی خوش سامانی میں
سمجھا تھا جزوِ باقی ہوں، میں اس دنیائے فانی میں
طاعت میں ہزاروں سرخم تھے، لاکھوں سطوت سے ڈرتے تھے
کچھ انساں رعبِ شوکت سے جھک جھک کر سجدے کرتے تھے
پُرکیف اُس کی اک محفل تھی اور وہ ساقیٔ محفل تھا
دھوکا دیتی تھی شان اُس کی گویا انسانِ کامل تھا
آخر گردش کی موجوں میں جب آ پہونچا قطرا بن کر
ادبار کا اک سیلاب اُٹھا، اور پھیل گیا دریا بن کر
فتنے کی صورت میں منشائے فطرت نے انگڑائی لی
شخصیّت پر غالب آکر، حرّیت نے انگڑائی لی
وہ قصر نشینانِ شاہی، وہ نازوں میں پلنے والے
وہ سطحِ زمیں پر تن تن کر مؤردں کی طرح چلنے والے

وہ جن کے گلابی گالوں میں جنّت کی صبحیں ڈھلتی تھیں
وہ جن کے پَرتو سے برقِ سینا کی شمعیں جلتی تھیں
آخر زندانِ تنگ میں محلوں سے آکر آباد ہوئے
دولت حشمت کچھ ساتھ نہ تھی، اِن قیدوں سے آزاد ہوئے
زنجیرِ سیاست پاؤں میں تھی اور بارِ سلاسل ہاتھوں میں
تصویرِ حوادث تھے گویا، سر گردش میں، دل ہاتھوں میں
جن سے عشرت وابستہ تھی وہ سارے رشتے ٹوٹ گئے
وہ قصر وہ ایواں خواب ہوئے، دل ٹوٹ گئے، جی چھوٹ گئے
وہ زار، وہ سلطانِ "رشیا"، جو حکمِ زنداں دیتا تھا
خود زنداں کا اک قیدی تھا، خود مجرم تھا قومیت کا
وہ جس کی حرارت سے دُنیا، بن بن کر برف پگھلتی تھی
وہ جس کے ایک اشارے پر "رشیا" کی گاڑی چلتی تھی
اب خود زنداں کی سڑکوں سے وہ برف ہٹاتا پھرتا تھا
تھا زار حقیقی معنوں میں، اُٹھتا تھا اور پھر گرتا تھا
آخر وہ اقبالِ شاہی ساتھ اُس کا ہمیشہ دے نہ سکا

لی قوم نے اُس کی جان مگر، بدلہ وہ کسی سے لے نہ سکا

اے زار یہ تیرا افسانہ دنیا کے لئے اک عبرت ہے
یوں گرتے ہیں چڑھنے والے، پستی انجامِ رفعت ہے

اے کاش تو اپنے اس انجامِ غمگیں سے واقف ہوتا
دُنیا سے اور دُنیا کے سنگیں آئیں سے واقف ہوتا

اے کاش تو دُنیا میں رہ کر، دُنیا سے غافل ہو جاتا
عرفان فریبِ ہستی کا پہلے سے حاصل ہو جاتا

اے زار کے ہمسر اے انساں! لے عبرت اِس افسانے سے
تجھ کو بھی یونہی مٹ جانا ہے دنیا کے عبرت خانے سے

اِس شخصیت پر ناز نہ کر، دھوکے سے نہ اپنے کام بنا
انجام کی بابا خیر منا، آغاز کو چھوڑ، انجام بنا

اے سرمایہ دار!

اے مئے پندار سے مخمور اے سرمایہ دار!
اے کہ ہے دولت پرستی تیرا بے مایہ شعار
اے کہ دولت ہی تری دنیا ہے اور دولت ہی دین
اے کہ تو دولت کو ہے سمجھا ہوا پروردگار
زعم میں سرمایہ داری کے یہ وحشت یہ جنوں!
قصۂ مزدور بھی سننا ہے تجھ کو ناگوار
تو کہ سرمائے کی مستی میں ہے سرخوش صبح و شام
تجھ کو کیا معلوم رفتارِ مدارِ روزگار
تو نے یہ دولت نچوڑی خون سے مزدور کے
اور پھر غمخواریٔ مزدور ہی تجھ پہ ہے بار
حقِ محنت اُس کا دینے میں تجھے سو عذر ہیں
ہیں عرق جس کی جبیں کا تیرے دُرِ شاہوار
اپنی عشرت گاہ میں تو محوِ خوابِ عیش ہے
اور مزدور اک شکستہ جھونپڑی میں اشکبار
اُس کی بربادی پہ تیرا دل کبھی سوزاں نہیں!
وہم ہے تجھ کو کہ تو انساں ہے، وہ انساں نہیں!
جانتا ہوں یہ غلط تقسیم ہے تقدیر کی
خواجگی تجھ کو عطا کی اور اُسے بے چارگی
قسمتِ عالم پہ ہے قبضہ مگر اللہ کا
وہ اگر چاہے بدل ڈالے تری تقدیر بھی
خاک اُڑا دے وہ گھڑی بھر میں خزانوں کی ترے
زرفشاں، مزدور کا ہو جائے دامانِ تہی

نعمتِ مقسوم کا ممنون ہونا چاہئے
صاحبِ دولت کو ہے تحدیثِ نعمت لازمی

تیرے سرمائے میں قسمت ہی غریبوں کی شریک
ورنہ کیوں تجھ کو ضرورت سے سوا دولت ملی

وہ بھی اک انسان ہو دُنیا میں تیری ہی طرح
گو بہت نادار ہے، لیکن ہے پھر بھی آدمی

خون پانی کرکے وہ بھرتا ہے تیری تھیلیاں
منحصر محنت پر اُس کی کامیابی ہے تری

عارضی دولت کے غرّے پر نہ یوں مغرور ہو
سوچ، کیا ہو حال تیرا تُو اگر مزدور ہو؟

اپنے ہم جنسوں سے اے منعم نہ وحشت چاہئے
جن کا تو مخدوم ہے اُن کی بھی خدمت چاہئے

وہ معاون ہیں ترے، ہمدرد ہیں ہمراز ہیں
حسبِ موقع تجھ کو ان کی بھی اعانت چاہئے

حقِ خدمت اُن کا دینا چاہئے دل کھول کر
جو وفا تجھ سے کریں، اُن سے مروّت چاہئے

دیکھ آنکھیں اُن کی ہیں لبریز خونِ گرم سے
ان مقدّس آنسوؤں کی کچھ تو عزت چاہئے

دیکھ محنت سے ہے جسمِ ناتواں اُن کا فگار
یہ ہیں تیرے دست و پا، اِن کی حفاظت چاہئے

دیکھ ان کے دل ہیں تیرے ظلم سے ٹوٹے ہوئے
ان کی دل جوئی بہ اندازِ محبت چاہئے

دیکھ وہ اک روشنی پھیلی اُفق سے، ہوشیار!
تجھ کو غافل امتیازِ نور و ظلمت چاہئے

نالۂ مظلوم پھر انتقام آنے کو ہے
اشتراکیت کا اک طوفانِ عام آنے کو ہے

ہلالِ رمضاں

اور

بسنت

ہلالِ ماہِ رمضاں آسماں پہ سرنگوں نکلا
بسنتی پیرہن میں بے قرار و بے سکوں نکلا

اِسے تُرکوں کے چہرے کی طرح گلرنگ ہونا تھا
اِسے ایرانیوں کی طرح شوخ و شنگ ہونا تھا

"بسنت" اس کی شعاعِ نور سے رنگین ہو جاتی
گھڑی بھر کے لئے نظارے کی تسکین ہو جاتی

یہ مغرب سے اُٹھا تھا چُلبلاپن کیوں نہیں اس میں؟
بتانِ مغربی کا رنگ روغن کیوں نہیں اس میں؟

اگر اِس کو دکھانا تھا تقدس ماہِ رمضاں کا
تو ہوتا ابروئے حورِ اِرم اندازِ عنواں کا

پیامِ صوم دے کر پھر اُفق میں ہو گیا پنہاں
چمکتے ہی اندھیرے کے عمق میں ہو گیا پنہاں

ہزاروں سال سے نقّاد ہے یہ بزمِ عالم کا
زمیں تھی ظلمتِ مطلق، یہ جب بھی بارہا چمکا

ملوکیت نہ تھی دنیا میں لیکن حکمراں یہ تھا
نہ تھا کوئی، مگر بامِ فلک سے ضوفشاں یہ تھا

عجم میں روم اور فارس کی دیواروں پہ یہ چمکا — عرب میں طیبہ و بطحا کے میناروں پہ یہ چمکا
کیا صدیوں تماشائے عراق و مصر و شام اس نے — گزارا سب سے پہلے سجدۂ بیت الحرام اس نے
پرانا اک مبصر ہے یہی تاریخِ عالم کا — تماشائی رہا تجدید اور تنسیخِ عالم کا
مسلمانوں کا اس نے فرِ عالم گیر دیکھا ہے — کرشن اور بودھ کا دورِ عظمت و توقیر دیکھا ہے
اسی کے سامنے گزرے ہیں سلجوقی و تاتاری — اسی کے سائے میں چمکے ہیں عباسی و قاچاری
ہمایوں اور اکبر کا تجمل اس نے دیکھا ہے — عروجِ روم و یوناں کا تنزل اس نے دیکھا ہے

اس آئینے کا غم آلودگی آئیں نہ تھا پہلے — یہ ساقیٔ تجلی تشنۂ تسکیں نہ تھا پہلے
مگر اس نے مکدر مطلعِ ہندوستاں پایا — مگر اس نے سوادِ ارضِ کابل "بے اماں" پایا
نظر ویرانیٔ اقوام شاید آگئی اس کو — یقیناً کربِ عالم کی خلش تڑپا گئی اس کو
یہ شاہد ہے کہ اب دنیا میں خطرے بڑھتے جاتے ہیں — تباہی کے سمندر اپنی حد سے بڑھتے جاتے ہیں
سمجھتا ہے کہ ہے مہمان صبح و شام کی دنیا — نہیں اب کام کی دنیا فقط ہے نام کی دنیا
بساطِ عشرتِ ہستی الٹنے پر ہے آمادہ — ورق رنگینیٔ عالم کا ہو جانے کو ہے سادہ

زمیں پر پھول ہی کیا، زرد ماہِ آسماں تک ہے
ہے مایوسی کا عالم، وسعتِ عالم جہاں تک ہے

مشرق سے مغرب کو

وطن سے جا رہے ہیں چھوڑ کر تسکیں فزا عالم
نظر میں اک نیا ہنگامہ، دل میں اک نیا ماتم

بہاروں کی یہ آمد، یہ ہماری ناگہاں رخصت
شگفتِ لالہ و گل، اور اپنا سینۂ پُر غم

یہ ہر ذرّے میں اک میخانہ، ہر میخانہ اک مستی
یہ جوشِ رقصِ برگ و گل یہ دُر افشانیٔ شبنم

یہاں کی خاک سے بھی عنبر و اکسیر پیدا ہے
بیابانِ وطن فردوسِ جنت سے نہیں کچھ کم

وطن کا امن، گھر کا عیش، دامن کش سہی لیکن
"مُرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم"

"جرس فریاد مے دارد کہ بربندید محملہا"

اِدھر فکرِ وطن میں رات دن مغموم جان و دل
اُدھر پُر شور آوازیں "سفر کرنے سے کیا حاصل"

اِدھر اپنا تہیّہ "اپنی منزل لے کے دم لیں گے"
اُدھر یہ فیصلہ "تم رہنمائی کے نہیں قابل"

اِدھر دعویٰ ہمارا یہ کہ "ہم حق کے معاون ہیں"
اُدھر بے اعتمادی یہ کہ "ہے ہر ادّعا باطل"

اِدھر در پیش اک لمبا سفر اور اس میں سو خدشے
اُدھر عزمِ سفر پہ مضحکے اور طعنۂ محفل

بھلا اِن مشکلوں کا کون کر سکتا ہے اندازہ
"شبِ تاریک و بیم موج، گرداب ایں چنیں حائل"

"کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا"

ہوا ہے ہم سے سرزد کونسا جرمِ شدید آخر؟
محبت کی وہ کیوں کرنے لگے قطع و برید آخر

کہاں استادِ مغرب اور کہاں بازی گرِ مشرق
کہیں اُستاد کو پہونچا ہے شاگردِ رشید آخر

کچھے بیٹھے تھے جو خلوت میں اپنی وضعداری سے
وہ خود کرنے کو آئے صلح کی گفت و شنید آخر

اسی کوشش میں ہم بھی جا رہے ہیں جانبِ مغرب
کہ یہ تاریک راتیں ہوں جوابِ صبحِ عید آخر

تمنا ہے کہ لوٹیں تو نہ یہ کہنا پڑے ہم کو
"ہمہ کارم زخود کامی بہ ناکامی کشید آخر"

"نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا"

آ

تسکیں کی طلب ہے تو مناظر کی طرف آ
باطن ترے بس کا نہیں ظاہر کی طرف آ

گلہائے محبت کی جو ہے تجھ کو ضرورت
گلخانۂ فطرت کے، مصوّر کی طرف آ

تا چند یہ آشفتگیٔ تشنہ مزاجی
میخانۂ جمعیتِ خاطر کی طرف آ

مل جائے گا صورت کدۂ امن کا رستہ
آ منزلِ معنیٰ کے مسافر کی طرف آ

مسجد ہو کہ ہو دیر حرم ہو کہ کلیسا
سب چھوڑ کے کاشانۂ شاعر کی طرف آ

مشکل وہ ترے ذہن کی آسان کرے گا
"شاعر" تری تسکین کا سامان کرے گا

گُلِ نافرمان

ہندوستان :-

اب کہاں پہلی سی میرے باغ کی رنگینیاں
غارتِ گلشن ہوئیں بے قاعدہ گُل چینیاں

تھیں بہاریں جن سے وہ سب پھول تر مردہ ہوئے
آتشِ گلشن جو تھے، وہ رنگ افسردہ ہوئے

نسترن ہے اب نہ نسریں ہے نہ ریحان و گلاب
لے گئی چُن کر خزاں صحنِ چمن کا انتخاب

اب نہ بیلا ہے کہ راتوں میں سحر تابی کرے
اب جوہی ہے کہ روح و دل کی سیرابی کرے

لالہ و گُل ہو گئے رخصت صبا روپوش ہے
رہ گئیں کلیاں تو اُن کی انجمن خاموش ہے

ہے مری دُنیا میں آج اک انقلاب آیا ہوا
ہر طرف باغوں میں "نافرمان" ہے چھایا ہوا

ہے فضا کی یہ اُداہٹ۔ جور کی تکمیل سے
جا بجا جسمِ گلستاں پر پڑے ہیں نیل سے

وہ تبسم ریز پھولوں کی صباحت ہی نہیں
رنگ و بُوئے باغ میں وہ جاذبیت ہی نہیں

رہ گئیں دل کی طرح گل ریز شاخیں ٹوٹ کر
لے گیا ہے کوئی پھولوں کی جوانی لُوٹ کر

اب کہاں وہ امن و تسکیں کی بہار افشانیاں
دورِ نافرماں ہے، زوروں پر ہیں نافرمانیاں

نافرمان :-

رد کشِ باغِ جناں اے جنّتِ ہندوستاں! ‏— لے کہ تُو ہے سوگوارِ انقلابِ گلستاں

مجھ سے ناحق ہی خفا میں خود جفا پروردہ ہوں ‏— درد دِ شمعِ سوختہ، سوزِ وفا پروردہ ہوں

آئینہ ہوں مٹنے والوں کے دلِ مایوس کا ‏— ہوں مرقع بیکسوں کی حسرتِ محبوس کا

میں گُل و نسرین کے احساسات کا اعلان ہوں ‏— ہوں میں "فرمانِ چمن" کہنے کو "نافرمان" ہوں

نوحہ خوانِ رنگ و بو، شاکیِ ناشادی ہوں میں ‏— رنگ سے میرے یہ ظاہر ہے کہ فریادی ہوں میں

جوشِ استبداد جب حد سے زیادہ ہو گیا ‏— رنگ اِس گلشن کا اُڑتے اُڑتے سادہ ہو گیا

باغباں اب بھی اگر شرمندۂ بیداد ہو ‏— پھر اُسی انداز سے صحنِ چمن آباد ہو

پھر وُہی ہو آب و رنگِ نسترین و نسترن ‏— پھر وُہی ہو شامِ سنبل اور صبحِ یاسمن

چھینٹوں سے پھر بدل جائے اُداسی باغ کی ‏— مشرقِ نورِ سویدا ہو سیاہی داغ کی

تیرے باغوں میں اگر تسکین کا ساماں ہو
کیوں نمودار آج ہر گوشے سے "نافرمان" ہو

امتحانِ شیخ و برہمن

گئے وہ دن کہ حامی باغباں کے تھے گل و لالہ
اب ہمیں خودنمائی ہو تو اُس میں شانِ خودرائی

خزاں اب کے چمن میں انقلابی بن کے آئی ہے
ہر اک گوشہ میں ہے بیگانگی کی کارفرمائی

نظر آتا ہے سرکش آج "نافرماں" ہر جانب
نہ جانے کس طرح کی اُسکی گلشن نے پذیرائی؟

حرم سے بتکدے تک ہر فضا لبریزِ شکوہ ہے
نہیں اب قابلِ برداشت اغماضِ کلیسائی

سرِ افراد میں پیدا ہوئی تمکینِ خودداری
نہ اب وہ آستاں بوسی نہ اب ہے وہ جبیں سائی

کہیں ہے شورشِ ساحل، کہیں ہنگامۂ محفل
قیامت بنکے اک شورش ہے دُنیا میں اُتر آئی

وطن کے شیفتہ سرشارِ احساسِ وطن سے ہیں
فدا ہیں ملّتِ مرحوم پر ملت کے شیدائی

نہ ہے خاموش مُسلم اور نہ ہندو مائلِ تسکیں
نہ اس میں صبر کی قوت نہ اُس میں ہے شکیبائی

الا اے انقلابِ ملک! یہ وقتِ تدبر ہے
نہ ہو جائے کہیں نقصِ عمل سے تیری رسوائی

الا اے رہبرانِ قوم ہنگامِ تفکر ہے!
قدم راہِ ترقی سے نہ ہو مجبورِ پسپائی

ضرورت ہے کہ ہو ہر کام میں اک متحد کوشش
ضرورت ہے کہ ہو قوموں کو احساسِ گوارائی

روا داری ہی اس منزل میں شرطِ کامیابی ہے
چلو مل کر کہ ربطِ باہمی ہے فرضِ یکجائی

سکوں کے ساتھ اپنے جادۂ مقصد پہ جا پہونچو
مزہ جب ہے کہ شورش ہو نہ ہو ہنگامہ آرائی

کہاں "فرقہ پرستی" اور کہاں سودائے آزادی
یہاں تو "وحدتِ قومی" ہی شرطِ جادہ پیمائی

وفا اک جذبۂ محمود ہے جس میں ہو جتنا ہو
وفا کا امتحاں دو ہی اگر دعوائے دانائی

"وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے"
"نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی"

"وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے"

اتحاد

ہے ربطِ عام بزمِ نسرین و نسترن میں
ذروں کی وسعتوں میں، تاروں کی انجمن میں

بیگانگی سبزہ اک رنگ پر ہے قائم
اوراق متحد ہیں پھولوں کے پیرہن میں

یہ لعنتِ تمدن، کہتے ہیں جس کو انساں
ہے اختلاف بیرا، اس دورِ پُرفتن میں

اب تک نہ اس نے سیکھا، با ایں ہمہ قدامت
آئینِ دوستداری اس محفلِ کُہن میں

امن و سکوں کی قوت بھولا ہوا ہے ہندی
ہے انتشار پیدا شیرازۂ وطن میں

یا رب یگانگت کو قوموں میں عام کر دے
یا پھر زمیں اُلٹ کر قصہ تمام کر دے

جبرِ باغباں

(زندگی اور موت پر زعمِ اختیار)

گلشن سے باغباں نے کہا کل تُسکا بتاؔ — کیوں میری خدمتوں کا نہیں ہے تجھے خیال؟
ہیں سینچتا ہوں تجھ کو محبت کے خون سے — ہیں میری سعی و فکر کا حاصل ترے نہال
گلچیں سے صبح و شام ہیں گلبازیاں تری — غیروں سے آشنا ہے تری خلوتِ جمال
شبنم سے کھیلتا ہے دمِ صبح ہولیاں — تجھ کو صبا کی چھیڑ نہیں وجہِ انفعال
اس جلوہ گاہِ رنگ و نوا کا خدا ہوں میں — میرے بغیر نظمِ گل و لالہ ہے محال
اے سرزمینِ سنبل و نسرین و نسترن — ہے فکر تیری نشو و نما کی مجھے کمال
پروا نہیں مگر مرے احساس کی تجھے — میں تیری اس ادائے تغافل سے ہوں نڈھال
تنگ آکے تجھ کو اس لئے دیتا ہوں اطلاع — میں تیرے اس ستم سے ہوں مجبورِ انتقال
تیرا یہی ہے رنگ تو ہو جاؤں گا فنا — تو جانتا ہے خوب مری موت کا مآل!
پیوست کر دے یا مرے سینے میں نوکِ خار — یا کر پئے جراحتِ دل سعیِ اندمال

یا مجھ کو اپنے صحن میں زندہ اُتار دے

گلشن نے دی ندا مرے ہمدرد باغباں!	اک وہم سے نہیں ہے زیادہ ترا خیال

تیری طرح یہاں بہت آئے چلے گئے	فطرت میں بوستاں کی نہ آیا مگر زوال

مرگ اور زیست پر کوئی قدرت نہیں تجھے	ہے مرگ و زیست تابعِ منشائے ذوالجلال

انساں کے اختیار میں ہوتی جو زندگی	ٹلتا جہان سے کفن و گور کا سوال

قابو جو اپنی موت پہ ہوتا اسے نصیب	سہتا نہ تلخیٔ غمِ ایامِ ماہ و سال

یہ جبر یہ ضد اور یہ تخویفِ خودکشی!	"بے اختیاریوں پہ ہے انسان کا یہ حال"

"کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے؟"

تنہائی

کیوں مرے گوشۂ عزلت سے تو گھبراتا ہے	اسی اک گوشے میں کونین سما جاتا ہے

سر بہ زانو کبھی خلوت میں اگر ہوتا ہوں	پرچمِ فکر مرا عرش پہ لہراتا ہے

ڈھونڈتی پھرتی ہے یہ شورشِ عالم جس کو	مجھ سے ملنے اسی تنہائی میں وہ آتا ہے

چشمِ وحدت نگر و جلوۂ یکتائی ہے

لاکھ ہنگاموں سے بہتر مری تنہائی ہے

بلراج کو ہمارا مشورہ

یہاں تو ہر قدم پر چاہیئے اک عزمِ فولادی
بہت دُشوار ہے اِس محبسِ عالم سے آزادی
یہ دُنیا مِٹ چکے تو اک جہانِ نَو ہویدا ہو
جسے تعمیر کہتے ہیں وہ ہے انجامِ بربادی
یہ ہنگامے، سکون و امنِ عالم کے مخالف ہیں
ترقی کا طریقہ چاہیئے سادہ، روِش سادی
تلاطم سا بپا ہے قلزمِ تسکیں کی موجوں میں
یہ کیسی امن کوشی ہے کہ خود ہے امن فریادی
رہائی تو بہر صورت مآلِ کارِ انساں ہے
کہ اِس زندانِ ہستی میں ہر اِک قیدی ہے میعادی
ابھی احساس کی بنیاد ہے اک نقش پانی کا
اساسِ سعیٔ ناقص ہو تو یہ ہے نقصِ بنیادی

اگر آئینہ و طوطی کی فطرت مٹ نہیں سکتی
تو ہے مشکل سکھانا صید کو آئینِ صیادی

فنا خود جذب ہو جائے گی اس "ہنگامہ کُن" میں
منظم ہو تو جائے عالمِ فانی کی آبادی

درائے کارواں میں اک توازن کی ضرورت ہے
صدائیں متفق ہوں گی تو گونج اُٹھے گی ہر وادی

موافق ہو فضا، تو شاید اس کی دید ہو جائے
ابھی سربستہ محمل ہے حُریّت کی شہزادی

لہو کی چند بوندیں چاہئیں عنوانِ افسانہ
کہیں سُرخ اشتہاروں سے ملا کرتی ہے آزادی

سر از پردہ بروں آرو بمیداں ترکتازی کن
دریں بازیچۂ ہستی بخونِ خویش بازی کن

آزاد و اسیر

آزاد:-

اے اسیرِ فصلِ گُل اے عندلیبِ بیقرار
کیوں قفس میں غمزدہ بیٹھا ہی سر ڈالے ہوئے؟
آنکھ میں آنسو ہیں، رعشہ ہے بدن پر بار بار
سر خمیدہ کیوں پڑا ہے بال و پر ڈالے ہوئے؟

تیری آہِ زیرِ لب سے مجھ کو ہوتا ہے یقیں
باغباں کا خوف ہی صیاد سے ڈرتا ہی تو
ہاں مگر سن لے کہ جو ڈرتا ہی وہ عاشق نہیں
جان پیاری ہی اگر تو عشق کیوں کرتا ہی تو؟

منزلِ عشق و وفا میں ہمتیں درکار ہیں
اپنی فریاد آزما، اپنی فغاں سے کام لے
خامشی بیکار، لب کی جنبشیں درکار ہیں
دامنِ صیاد کیا، صیاد کا دل تھام لے

لے وہ انگڑائی کہ آ جائے حمیت جوش میں
رشتہ بر پا تا بکے، اُٹھ حشر کا سامان کر
جان ڈال آہوں سے اپنی جراَتِ خاموش میں
اور ہو سینہ سپر نالوں کی برچھی تان کر

تجھ کو احساسِ اسیری ہے، تو کچھ تدبیر کر — ایک نعرے سے در و دیوارِ زنداں توڑ دے
اک فغاں دل گیر اک فریاد عالم گیر کر — ہو یہ ناممکن تو آزادی کی حسرت چھوڑ دے

اسیر:-

اے مشیرِ نالہ و فریاد اپنی راہ لے — کیوں مجھے کنجِ قفس میں چھیڑنے آیا ہے تو
جان پر اپنی نہ میرا صدمۂ جانکاہ لے — لَوٹ جا پیغامِ آزادی اگر لایا ہے تو

درسِ شورش کا خلافِ مشربِ تسلیم ہے — یہ نہیں معلوم اگر تجھ کو، تو اب معلوم کر
میری فطرت کو محبت کی یہی تعلیم ہے — شکر کے سجدے کروں لوہے کی کڑیاں چوم کر

نالے کرنا جانتا ہوں واقفِ نالہ ہوں میں — میں کوئی ناآشنائے حربۂ فریاد ہوں؟
اس چمن میں خالقِ داغِ دلِ لالہ ہوں میں — مصلحت یہ ہے کہ پر بستہ ہوں ورنہ شاد ہوں

گلستاں نزدیک تر ہے خانۂ صیاد سے — ہیں جوانانِ چمن مصروفِ خوابِ ناز میں
میں قیامت کیوں بپا کر دوں لبِ فریاد سے — آگ پھولوں میں لگا دوں، زہر بھر دوں ساز میں؟

نالہ آساں ہے مگر مشکل ہے ضبطِ آرزو
ضبط سے مایوس ہو جاؤں تو پھر نالا کروں
ضبط اک بجلی ہے خرمن کی ہے جس کو جستجو
وقت آ جائے تو گلشن کو تہ و بالا کروں

کاوشوں کی بجلیاں جب شعلہ افشاں ہو گئیں
خود بخود رنگِ چمن آتش فگن ہو جائے گا
ضبط کی چنگاریاں جب روز تاباں ہو گئیں
یہ قفس بھی خاکِ رنگینِ چمن ہو جائے گا

منتظر منشائے فطرت کا ہوں خاموشی کے ساتھ
ہے بڑی آسودگی صبر و رضا میرے لئے
بند ہوں کنج قفس میں خود فراموشی کے ساتھ
کوئی رستہ کھول ہی دیگا خدا میرے لئے

ہے نگاہوں میں خدا کی مورد بیدادِ قید
کچھ نہ کچھ قسمت کا اس کی فیصلا ہو جائے گا
زندگی دو دن کی ہے لمبی سہی میعادِ قید
آج آیا ہے قفس میں کل رہا ہو جائے گا

بھولے ہوئے فسانے

دُھرا رہی ہے دنیا بھولے ہوئے فسانے
یاد آ رہے ہیں اس کو گزرے ہوئے زمانے

خالی پڑی ہوئی ہیں وہ ڈالیاں چمن میں
آراستہ تھے جن پر رنگین آشیانے

ہو صُورِ غزنوی یا تکبیرِ ابنِ قاسمؓ
سب ہیں اسی چمن کے گونجے ہوئے ترانے

شخصیتوں کی پیہم کچھ آندھیاں چلی تھیں
جتنی ترقیاں تھیں سب لگ گئیں ٹھکانے

یہ قوم اپنی اصلی رفتار چھوڑ بیٹھی
آیا نیا زمانہ، رخصت ہوئے پرانے

اسلاف کے چلن سے اخلاف کو ہوئی ضد
نکلے فروع بن کر کچھ تازہ شاخسانے

تقلیدِ غیر قومی، بد رسمیوں کی کثرت
تہذیب نے سجائے کیا کیا نگار خانے

گزرے ہوئے زمانے اب یاد کر رہے ہو
کس طرح لوٹ آئیں گزرے ہوئے زمانے

ہاں پھر اگر تمہیں ہو احساسِ قوم و مذہب
مل سکتے ہیں دوبارہ غارت شدہ خزانے

صیاد خود ہی کر دے تم کو رِہا قفس سے
خود بجلیاں سجا دیں شاخوں پر آشیانے

باتیں بہت ہیں تم میں لیکن عمل نہیں ہے
تھی یہ بھی ایک نعمت جو چھین لی خدا نے

کمزوریوں کا اپنی ناحق ہے عذر تم کو ۔۔۔ کمزوریاں کہاں ہیں۔ یہ ہیں فقط بہانے
ہے ہر عمل میں پنہاں قوت کی ایک بجلی ۔۔۔ تیرِ عمل کے خالی جاتے نہیں نشانے
پھر نام سے خدا کے آغازِ کار کر دو ۔۔۔ آثارِ نو ہیں پیدا بدلا ہے رخ ہوا نے
قدموں پہ پھر تمہارے جھکنے لگے زمانہ ۔۔۔ ہوں سجدہ گاہِ عالم ملت کے آستانے

ثابت کرو کہ تم ہو عالم نواز اب تک
باقی ہے ان رگوں میں خونِ حجاز اب تک

مذہب

مذہب اک رشتہ ہے مابینِ عباد و معبود ۔۔۔ نہیں اغراض پرستی کے لئے اس کا وجود
مذہب اک رشتہ ہے جمعیت عالم کے لئے ۔۔۔ عشرتِ فطرتِ آزاد ہیں مذہب کی قیود
روح کر سکتی ہے محسوس تقدس اس کا ۔۔۔ اس کی قوت ہے شدید اس کا اثر لامحدود
کر دیا جس کی مساعی نے اسے عالمگیر ۔۔۔ اس پہ لاکھوں ہوں سلام اور کروروں ہوں درود
مذہب امن اور تسلی کا ہے مضبوط حصار ۔۔۔ اس کے پیرو پہ ہیں شیطان کی راہیں مسدود

اک یہی مرکزِ رحمت ہے ہر انساں کے لئے
مذہبِ عقل میں ہے منکرِ مذہب مردود

محمد علیؒ

خاطرِ آزردہ شریکِ انجمن ہوتا ہوں میں
مجھ پہ رولے روحِ آزادی تجھے روتا ہوں میں

سیکڑوں تجھ پر سلام اے طائرِ سدرہ نشیں
تو دمِ پرواز نکلا شہپرِ روح الامیںؑ

عمر بھر آباد رکھا تو نے گھر صیاد کا
زیرِ لب تڑپا کیا طوفاں تری فریاد کا

جب فضا تجھ کو بہ اندازِ تکلم مل گئی
ایک نالہ تو نے وہ کھینچا کہ دنیا ہل گئی

تو قفس میں تھا ہوا خواہِ اسیرانِ وطن
تھی اسیری میں بھی تجھ کو فکرِ درمانِ وطن

رعب سے جن کے زبانیں آج تک خاموش ہیں
چند وہ فقرے ترے اب بھی نصیبِ گوش ہیں

زندگی تو نے عطا کی ہستیِ ناکام کو
ہے نویدِ شہرتِ جاوید تیرے نام کو

خوابگہ بھی تیری بیزارِ غلام آباد ہے
جیتے جی آزاد تھا، مرکر بھی تو آزاد ہے

ہمصفیرانِ چمن کو پھر ہے تیرا انتظار
بے ترے کچھ بے مزہ سا ہے تماشائے بہار

چہچہوں سے اب بھی گو معمور ہے یہ گلستاں
روح کو تڑپانے والے وہ ترے نغمے کہاں!

یہ وطن تیرا گنہگارِ غلامی ہے ہنوز
سنگِ جادہ کوششوں کی ناتمامی ہے ہنوز

گو جرس پر شور ہے، چلنے کا ساماں بھی تو ہو — کارواں تیار ہے کوئی حدی خواں بھی تو ہو
دل ہے مطلق برق بننے کے لئے بیتاب پھر — شعلہ افشاں ہو رہا ہے دیدۂ بے خواب پھر
ہے اندھیری رات، ساری انجمن خاموش ہے — محفلِ امروز جویائے چراغِ دوش ہے
زندگی کی کشمکش میں دم نہ گھٹ جائے کہیں — تیرگی میں کارواں اپنا نہ لٹ جائے کہیں

غم گساراں! چارہ سازِ اضطرابِ ما کجاست؟
تیرہ شد احوالِ مشرق، آفتابِ ما کجاست؟

رہنما

قافلہ آوارہ ہوتا ہے جب اپنی راہ سے — روشنی اک پھوٹتی ہے ہر دلِ آگاہ سے
ذوقِ منزل دعوتِ آلام دیتا ہے انھیں — جو ابھی واقف نہیں ہوتے غمِ جانکاہ سے
خود امیرِ کارواں بنتی ہے گردِ کارواں — سیکھ لیتی ہے حدی خوانی جرس کی آہ سے
ٹوٹتا ہے یہ طلسمِ عارضی انجامِ کار — رہگزارِ ارتقا کی شورشِ ناگاہ سے
مشرقی و مغربی دونوں نہیں ہیں کامیاب — پوچھئے دشواریاں منزل کی مہر و ماہ سے

جاذبِ تنویر پروانے تو لاتعداد ہیں
لو لگی ہے شمعِ منزل کی مگر اللہ سے

جذب وسلوک

کام ہونا چاہیئے وعدوں سے کچھ حاصل نہیں — اب فقط امید ہی وجہِ سکونِ دل نہیں

دل میں سب کچھ ہے مگر اظہار کے قابل نہیں — دوسرا دل ہے ہمارا عقدۂ مشکل نہیں

اہلِ غیرت ہیں پشیمانیِ ماضی سے ہلاک — حال میرا یہ کہ مجھ کو فکرِ مستقبل نہیں

گردشوں سے ساز ہے آوارہ بختی کو مری — اُس طرف مشعل دکھاتی ہیں جدھر منزل نہیں

جس کو دیوانے ترا احسن کرم سمجھا کئے — وہ فریبِ لطف اب برداشت کے قابل نہیں

وہ کسی مقصد سے ہو، ہے تو انھیں میرا خیال — ظلم کے قابل تو ہوں، گو رحم کے قابل نہیں

کاہشِ واماندگی سے تو نہیں واقف ہنوز — اُس کے دل سے پوچھ جو آسودۂ منزل نہیں

اک صدا کنجِ قفس سے آئی اور تڑپا گئی — کوئی کہتا تھا رِہا ہونا مرا مشکل نہیں"

غم کا درماں سہل ہے لیکن جو دل ہو غم شناس — یعنی جس مشکل کا ہو احساس وہ مشکل نہیں

آگ لگ جائے گی سوزِ دل سلامت چاہیئے — ہم تو باقی ہیں، جو باقی گرمیِ محفل نہیں

کامیابی کی تمنا ہے تو کچھ تدبیر کر — صرف قسمت کا گلہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں

شوق کی پامردیوں میں عزمِ راسخ چاہیئے — ہو نہ جس کی انتہا ایسی کوئی منزل نہیں

ہو چکیں طے جادۂ مقصود کی دشواریاں
اب نہیں مشکل کوئی اس راہ میں حائل نہیں

ہیں ہماری نارسائی کے بظاہر دو سبب
یا تو آگے بڑھ گئے ہم یا ابھی منزل نہیں

آزمائش سرفروشوں کی ہوئی ہے بار بار
امتحاں گاہِ وفا کوئی نئی منزل نہیں

ہے گزرگاہِ طلب میں احتیاجِ احتیاط
یہ وہ منزل ہے ابھی جس کی حد یکا مل نہیں

پھر وفا کی محفلیں آراستہ ہو جائیں گی
ہمتِ دل کو غمِ تاراجیٔ محفل نہیں

جوش کہتا ہے لگا دو وسعتِ عالم میں آگ
عقل کہتی ہے کہ وقتِ گرمیٔ محفل نہیں

سالکِ تدبیر ہوں غالب نہیں جذبِ غلط
ناشکیب اتنا ابھی سیماب میرا دل نہیں

مُبلّغِ اعظمؐ

ساقیٔ بزمِ کائنات، قاسمِ کیفِ بیخودی
آیۂ رحمت و نجات، عقدہ کشائے زندگی

غازۂ مہرِ تابناک ہے تری رہگزر کی خاک
ذرّۂ آستانِ پاک کوکبِ افسرِ شہی

کان جب آشنا نہ تھے نغمۂ صبحِ عرش سے
ظلمتِ کفرزار میں پہلی اذان تو نے دی

عیدِ ناقص

اے مسلماں، اے خرابِ نشۂ نام و نمود — ہو چکا مسرور مفروضاتِ روزِ عید سے
تو لباسِ نو پہن کر خوب اِتراتا پھرا — سانپ لہراتا ہو جیسے کھال کی تجدید سے
صبح کھانے اور پینے میں رہا مصروف تُو — اپنا معدہ صاف کر کے مُسہل و تبرید سے
شام کو تھا حُسنِ آوارہ ترا کیفِ نظر — تھیں عیاں بدمستیاں تیرے مذاقِ دید سے
تو رہا خوش قامتوں سے خوب شب بھر ہمکنار — بوالہوس کی طرح، حظِ نفس کی امید سے

الغرض یہ عید تھی تیری، بہ عنوانِ ہوس — ہے ترا انجام ظاہر اس تری تمہید سے
کیا ترے دل میں ذرا بھی اُلفتِ اسلام تھی؟ — کیا تجھے کچھ واسطہ تھا جذبۂ توحید سے؟
کیا اسیروں کا الم تیری خوشی میں تھا شریک؟ — تیرگی نازل تھی تجھ پر مطلعِ خورشید سے؟
کیا ترا اسراف تیری جیب کا ممنون تھا؟ — کیا تو خوش تھا اپنے دل کی واقعی تنقید سے؟
سچ بتا اُس وقت کیا واقف نہ تھا تیرا ضمیر؟ — ملتِ اسلام کی تہدید یا تحدید سے؟

اپنی عیدِ ظاہری پر اک نگاہِ فکر و غور!
عذرِ بے معنی نہ کر، تا دیل اور تردید سے

آگ پھیلے گی نہ کیا تیرے برے اعمال کی؟
تیری نسلیں کیا نہ بگڑیں گی تری تقلید سے؟

ذرّوں کا مستقبل

نہ ٹھکرا خاک کے ذرّوں کو یوں پائے حقارت سے
کہ ہر ذرہ ہے اک رکنِ رکینِ ایوانِ ہستی کا

خزانے دفن ہیں زیرِ زمیں حسن و لطافت کے
یہیں موجود ہے سامان اِس مرحوم بستی کا

خمیدہ سر تو ہو، وسعت تو دے اپنی بصیرت کو
ہر اک نقشِ فسردہ درس ہے رفعت پرستی کا

غرور و کبر جوہر بنکے اب تک اُڑ گئے ہوتے
اگر ٹھنڈا نہ پڑتا جوشِ آتش زارِ ہستی کا

یہ ہر ذرّہ، حقیقت جس کی سمجھی ہی نہیں تو نے
ستارہ ہے ستارہ! آسمانِ ناز و مستی کا

پسِ تکمیل جب اجسام مل جاتے ہیں مٹی میں
اُبھر آتا ہے ذرّہ بن کے حصہ نقشِ ہستی کا

ہیں مستقبل بدامن جن کو ذرّے جانتا ہے تو
اثر ان پر نہیں مطلق فنا کی چیرہ دستی کا

یہی ذرّے کسی دن جوشِ فطرت سے جواں ہوں گے
انھیں ذرّوں سے پیدا پھر زمین و آسماں ہوں گے

سوسائٹی

وہ اک ناپاک مجمع، وقت ضائع کرنے والوں کا
وہ ہیبت ناک مرکز زہر آلودہ خیالوں کا
مہذّب ایک محفل ڈاکوؤں کی اور لٹیروں کی
منظّم ایک ٹولی شعبدہ پیشہ سپیروں کی
وہ ناجائز جتھا، خود رائے، خود بیں، خود پرستوں کا
وہ ناشائستہ حلقہ بے حیاؤں، فاقہ مستوں کا
خطرناک اک جماعت، خود غرض بے اعتمادوں کی
شر انگیز ایک مجلس، وقت کے شیطان زادوں کی
وہ اک باطل کدہ حق کی جہاں پرستش نہیں ہوتی
"ضمیر و روح" کی تا دُور گنجائش نہیں ہوتی
وہ سازش گاہ، ہوتی ہے جہاں تخریب انساں کی
وہ آتش گاہ، بھکتی ہے جہاں تہذیب انساں کی

جہاں بد رسمیوں کی پاؤں میں پڑتی ہیں زنجیریں
جہاں بربادیٔ اخلاف کی ہوتی ہیں تدبیریں
ریاکاری جہاں ڈھلتی ہے مکاری کے سانچوں میں
جہاں اقبال جلتا ہے حسد کی تیز آنچوں میں
وہ اک مذبح، جہاں کٹتی ہے گردن بے گناہوں کی
وہ اک مقتل، جہاں چلتی ہیں چھریاں بدنگاہوں کی
وہ شورش گہ، جہاں فتنے نئے پیدا رہوتے ہیں
جہاں قانون بغض و کبر کے تیار ہوتے ہیں
کہاں جاتا ہے تو لٹنے کو اس طوفانِ غارت میں؟
جسے سمجھا ہے "جنت" وہ جہنم ہے حقیقت میں
نہ جا "محفل" میں اک "دل" ڈھونڈ اور اس میں نہاں ہو جا
سکوں درکار ہے تو بے نیازِ این و آں ہو جا

زدنیا بے تعلق باش، وانگہ ہرچہ خواہی کن
بہ جلوت دل میاویز و بہ خلوت بادشاہی کن

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا

جب وطن کی سرزمیں گھر جائے برق و باد سے
جب جہنم پھوٹ نکلے خرمنِ بیداد سے

جب بڑھیں تاریکیاں گمراہی و عدوان کی
جب صدا آنے لگے ہر سانس سے شیطان کی

جب حقیقت پر گراں ہو جائے باطل کا حجاب
جب پسینہ ظلم کی بدبو سے بن جائے شراب

جب رگیں انسانیت کی، بربریت توڑ دے
بیکسی کو جب غرورِ نفس تنہا چھوڑ دے

جب نواسنجی دبائی جائے شورِ جنگ سے
خون ٹپکے پھول کے اوراقِ مینو رنگ سے

جب غریبوں کا لہو پینے لگیں سرمایہ دار
جب فقط اغراض پر نیت کا ہو دار و مدار

جب وطن میں موجزن بیداد کا طوفان ہو
اور جب ماحول اس درجہ غلط سامان ہو

عزمِ ہجرت چاہیے رشتے وطن کے توڑ کر
جس طرح موتی نکل آتا ہے سیپی چھوڑ کر

ہجرت اک حربہ ہے تسلیم و رضا کے ہاتھ میں
ہجرت اک رگ ہے حمیت کی، وفا کے ہاتھ میں

ہجرت اک احساس ہے روٹھا ہوا بپھرا ہوا
ہجرت اک جذبہ ہے خودداری سے گرمایا ہوا

ہجرت اک گہرا طمانچہ گرم رخساروں پہ ہے
ہجرت اک مضبوط تیشہ آہنی تاروں پہ ہے

ہجرت اک خاموش جنگِ حق و استبداد ہے
ہجرت اک دل دوز، بے آواز کی فریاد ہے

ہجرت اک مظلومیت کا ہے مقدس احتجاج
ہجرت اک دردِ غلامی کا ہے روحانی علاج

ہجرت اک تمہید ہے وصلِ دلِ مہجور کی
ہجرت اک تجدید ہے عزمِ طلب دستور کی

ہجرت اک حملہ ہے مجبوری کا قصرِ جبر پر
ہجرت اک ٹھوکر ہے پندار و حسد کی قبر پر

فائزِ ہستی ہے جو اس راہ کا رہگیر ہے
منزلِ لیلےٰ کی ہجرت آخری تدبیر ہے

شہید

دخلِ بیگانہ کہاں جلوہ گہِ راز میں ہے
ہے کوئی اور، جو اس منزلِ ممتاز میں ہے

وہ اجل دوست، وہ پروردۂ آغوشِ قضا
زندگی جس کی نگاہِ غلط انداز میں ہے

کھیلنا خاک میں اور خون میں جس کو ہے پسند
جس کی اک خاص جگہ انجمنِ ناز میں ہے

جسے پروائے لحد ہے نہ تمنائے کفن
رنگِ تسلیم و رضا جس کے ہر انداز میں ہے

حدِ معلومۂ ہستی سے گزرتا ہی نہیں
ہے یہی صرف وہ انسان، جو مرتا ہی نہیں

خزاں سے کیجیے شکوہ چمن کو کیا کہیے
فسردگیٔ گل و نسترن کو کیا کہیے

وہ حُسن غارتِ اہلِ جہاں ہے سرتاپا
ادا کو موت کہا، بانکپن کو کیا کہیے

ہر ایک خم میں ہیں عقدے ہزار لاینحل
کسی کی زلفِ شکن در شکن کو کیا کہیے

ہوائے نغمہ نے جان اور دل کو پھونک دیا
گدازِ سازِ سرِ انجمن کو کیا کہیے

صنم کدے سے پھرا شیخ، کیا علاج اسکا
حرم سے بیر کیا برہمن کو کیا کہیے

ہر اک صدا سے ہے بیدار اک قیامتِ نو
یہی ہے نغمہ تو پھر نغمہ زن کو کیا کہیے

لبِ زباں کو بھی اب سازباز ہے اُس سے
دہانِ کام و دہن ہی سخن کو کیا کہیے

بنایا مالکِ کل، دے کے رہروں کو پناہ
خرابِ اہلِ وطن ہیں، وطن کو کیا کہیے

جہاں تھی موجِ رواں، خاک اُڑ رہی ہے وہاں
خرامِ تشنۂ گنگ و جمن کو کیا کہیے

روا نہ تھا کہ ہو غمّاز کی صدا پہ ہلاک
فریب خوردگیٔ کوہکن کو کیا کہیے

ریا و باطل و پندار کی نمائش ہے
سرائے دہر طلسمِ فریب و سازش ہے

منافق جس کو مارِ آستیں کہتے ہیں دُنیا میں
وہ ہے اک خطرۂ خاموش آغوشِ تماشا میں

لہو پیتا ہے بنکر سانپ، اخلاص و محبت کا
وہ ڈاکو ہے، وہ غارتگر ہے انسانی شرافت کا

تبسّم اُس کے لب پر صرف دھوکا یا نمائش ہے
حقیقت کے چھپا لینے کی اک ناپاک کوشش ہے

عیاں اُس کے تکلّم سے حلاوت ہے محبت کی
مگر ہر لفظ میں پنہاں ہے سمیّت ہلاکت کی

بظاہر اُس کی باتوں سے ہوا خواہی ٹپکتی ہے
ریا کی آگ لیکن اُس کے سینے میں بھڑکتی ہے

وہ اک تنّور ہے جس پر سپیدی غازہ افشاں ہے
وہ اک زنبور ہے جو خوشنما رنگوں میں پنہاں ہے

دل اُس کا مزبلہ ہے اور گندہ ہے زباں اُس کی
کثافت سے ہیں آلودہ خیال آرائیاں اُس کی

زباں پہ کچھ ہے دل میں کچھ، نمونہ ہے دو رنگی کا
خود اُس کا ہر عمل شاہد ہے اُس کے دل کی تنگی کا

وہ اک شیطان ہے انساں کی پُر اسرار صورت میں
وہ اک طوفان ہے، سمٹا ہوا خس پوشِ خلوت میں

وہ اک بہروپیا ہے، ایک نقّالِ شرافت ہے
وہ اک انسانِ مصنوعی ہے ننگِ آدمیت ہے

خبردار اُس سے اے یارانِ سادہ، ہوشیار اُس سے!
کہیں مانوس ہو جائے نہ چشمِ اعتبار اُس سے!

منافق کو تم اپنے دل کی دنیا سے جدا کر دو
حدودِ دوستی سے اس کی ہستی کو فنا کر دو

کچل ڈالو، لگا کر ٹھوکریں نفرین و لعنت کی
منافق ہے بڑی توہین دنیائے محبت کی

مٹا دینا ہی اس کا مصلحت اے اہلِ عالم ہے
کہ فردوسِ وفا میں یہ مجسم اک جہنم ہے

مسلم یونیورسٹی سے خطاب

اے عروسِ علم و تدبیر و عمل، عمرت دراز!
کچھ مجھے کہنا ہے تجھ سے بر بنائے صد نیاز

مصلحت نے مغربی قالب میں ڈھالا ہے تجھے
سننے والے ہیں حجازی گو کلیسائی ہے ساز

کھینچ لے گی دل کو جس پردے میں بول اٹھے گی تو
پاسِ بربط کر نہ اے موسیقیٔ بربط نواز

دلفریبی گیسوئے مغرب کی دامن کش سہی
ہے بہت باقی ابھی سیرِ خمِ زلفِ ایاز

جادۂ تجدید میں اپنی الگ دنیا بنا
دیکھنے آئے جسے ہر دیدۂ مغرورِ ناز

دے سکے تیری نوا پیغامِ فطرت قوم کو
بن سکے صورِ حقیقت تیری آہنگِ مجاز

ارتقا کے دوش پر اک عرش ہو تیرا عروج
طرز میں بھی اعتلا ہو، وضع میں بھی امتیاز

جذبۂ پابندیٔ تقلید کو تعطیل دے
درسِ دیرینِ حرم کو فرصتِ تکمیل دے

جوشِ انتقام

اُٹھا دو چنگ و رباب آج بزمِ عشرت سے
کہ آ رہا ہوں میں صد محشرِ جنوں بردوش

ہے میرے ساتھ پریشانیوں کی اک دُنیا
نہیبِ حشر شکار و فغانِ صُور فروش

نظامِ بزمِ محبت کو مژدۂ تغیر
اک انقلاب ہے میرے درود میں ردکوش

شروع ہوتے ہیں کچھ واقعاتِ نَوساماں
کہو کہ ختم کرے قصہ خواں فسانۂ دوش

مسل کے پھینک دو پھولوں کو آئینے توڑ دو
ہٹا دو پردۂ رنگین و مسندِ گُل پوش

میں ذمّہ دار نہیں برہمیِ محفل کا
کہ میری بے خبری ہے وداعِ عالمِ ہوش

اب اپنے جوش سے ہشیار مستیِ مینا
اب اپنی خیر منائے غرورِ بادہ فروش

مری نظر میں فنا، سانس میں ہلاکت ہے
میں ہوں خرابِ پریشانی و خرابی کوش

خلوص و مہر و محبت کا ماتمی ہوں میں
فریب خوردۂ نیشِ ستم بہ پردہ نوش

حقیقتوں پہ ہیں آثارِ تیرگی طاری
سحر نہیں ہے کہ ہو جاؤں مثلِ شمع خموش

مجھے جہانِ ریا کی جڑیں ہلانی ہیں
صداقت اور حمیت کے ولولوں میں ہے جوش

کمالِ ہمت و قوت سے کام لینا ہے
منافقوں سے مجھے انتقام لینا ہے

اعلانِ جنگ — دعوتِ انقلاب

یزید آبادِ ہستی میں ایک "حسینؑ" کی پھر ضرورت ہے!

نہیں جو مائلِ تجدید اب جہاں کا نظام
اعادہ خواہ ہے تاریخِ ماضیٔ ایام

جو رنگِ دہر تھا پہلی صدی کے آخر میں
اُسی کے ہاتھ میں ہے چودھویں صدی کی لگام

وُہی فجور، وُہی فسق کی ہے ارزانی
وُہی خودی ہے وُہی خود روی شعارِ عوام

ہزار آئے زمانے میں انقلاب مگر
وہی ہے کوششِ عشرت وہی ہے گردشِ جام

نماز و روزہ پہ ہونے لگا ہے استہزا
کوئی ہے بندۂ دولت، کوئی بتوں کا غلام

کوئی ضمیر فروش اور کوئی دین فروش
عجب نہیں جو خدا کا یہ بول دیں نیلام

اُسی کے ہاتھ پہ بیعت کو لوگ بڑھتے ہیں
جسے سمجھتے ہیں رمز آشنائے شُربِ مدام

حریصِ سجدہ شوالے میں ہے بتِ پندار
حریفِ ربِّ حرم ہے مجاورِ اصنام

پلی تھی سایے میں جو توم تیغ و خنجر کے
اب اُس کو صرف جمود و خمود سے ہی کام

تو کیا یہاں بھی نتیجہ وُہی نہ نکلے گا؟ ہوا تھا پہلی صدی میں جو کام سرانجام
شہیدِ قوم نہ کیا آج کوئی اُٹھے گا؟ نوائے "جاھِدُوا" برلب، قیامتے بہ نیام
الٰہی بھیجدے ابنِ علیؓ کو پھر اک بار کہ ہر طرف سے ہے خطرے میں حرمتِ اسلام
وہ آئیں اور کریں انتظامِ ملت دیں جہاں میں باعثِ تنظیم ہو نزولِ امام
جہانِ کفر کو پیغامِ جنگ دیں آکر یہ فتحِ خاص لکھی جائے ذوالفقار کے نام

حسینؑ ابنِ علیکرمؑ، وہ مجاہدِ ملت کہ جن کے نام سے لرزش میں تھا حرابۂ شام
شہیدِ جور و قتیلِ جفا و کُشتۂ قوم شجاع و صابر و مردِ وفا، امامِ انام
(ہوں اُن پہ اور تمام اہلبیت پر اُن کے ہر ایک لمحے میں لاکھوں درود اور سلام)

غلط کہ خدمتِ اسلام فرضِ عین نہیں
یزید اب بھی ہیں لاکھوں مگر حسینؑ نہیں

مزدُورْ

گرد چہرے پر، پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی
آنسوؤں میں کُہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر ناقابلِ برداشت اک بارِ گراں
ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جُھرّیاں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا
پاؤں مٹّی کی تہوں میں میل سے چکٹے ہوئے
ایک بدبودار میلا چیتھڑا باندھے ہوئے
جا رہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا
ہانپتا، گرتا، لرزتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
چار پیسے کی توقُّع، سارے کُنبے کا خیال

اپنے ہم جنسوں کی بے مہری سے مایوس و ملول
صفحۂ ہستی پر اک سطرِ غلط، حدِ فضول
اپنی خلقت کو گناہوں کی سزا سمجھے ہوئے
آدمی ہونے کو لعنت اور بلا سمجھے ہوئے
زندگی کو ناگوار اک سانحہ جانے ہوئے
بزمِ کبر و ناز میں فرض اپنا پہچانے ہوئے
راستے میں راہگیروں کی نظر سے بے نیاز
شورشِ ماتم سے، نغموں کے اثر سے بے نیاز
اِس کے دل تک زندگی کی روشنی جاتی نہیں
بھول کر بھی اِس کے ہونٹوں پر ہنسی آتی نہیں
ایک لمحہ بھی نہیں فکرِ معیشت سے نجات
صبح ہو یا شام، ہے تاریک اِس کی کائنات
دیکھ اے قارونِ اعظم، دیکھ اے سرمایہ دار!
نامرادی کا مرقّع، بے کسی کا شاہکار!
گو ہے تیری ہی طرح انساں، مگر مقہور ہے
دیکھ لے دولت کے اندھے سانپ! یہ مزدور ہے!

نوجوان ہندوستان سے

قدیم دورِ حدیثِ چمن تمام ہوا
طویل قصۂ سرو و سمن تمام ہوا

سجاؤ ایک نئی بزم شام سے پہلے
سحر ہوئی اثرِ انجمن تمام ہوا

جو میکدے میں تھا ہنگامہ آفریں کل تک
وہ آج "شورِ بہار و شکن" تمام ہوا

نئے سبو نئے پیمانے بار یاب کرو
تمام مایۂ یارانِ فن تمام ہوا

حریمِ نو سے مغنّیِ نو کو دو آواز
شکستہ نغمۂ سازِ کہن تمام ہوا

ابھی ہے جوش پہ گرمیِ محفلِ منصور
کہاں فسانۂ دار و رسن تمام ہوا

نشاطِ کار تو باقی ہے، ہم نہیں نہ سہی
غلط خیال ہے، کارِ وطن تمام ہوا

حیاتِ تازہ ہے، انجامِ ہر حیات کے بعد
یہاں طلوعِ سحر لازمی ہر رات کے بعد

بہار، موت کا پیغام ہے خزاں کیلئے
یہ انقلاب مبارک ہو باغباں کیلئے

جو خاکِ جادہ نہ ہر پیش رو کو جذب کرے
تو راہ بند ہو پس ماندہ کارواں کیلئے

نئی نئی روشیں باغ میں ہوئیں پیدا
نویدِ سیر جوانانِ گلستاں کیلئے

نئے اصول مرتب کریں برائے چمن — بنائیں کچھ نئے آداب آشیاں کیلئے
بہار اب کے جو آئے تو پھر نہ جائے کبھی — ہو بند و بست قفسِ عیشِ جاوداں کیلئے
جبینِ ذوق مہیا کرے نئے سجدے — وطن کی خاک محبت کے آستاں کیلئے
نئی فضا ہو نئے ولولے، نئے جذبات — دعائے خیر تمنائے رفتگاں کیلئے

جواں دلوں میں پھر اک عزمِ کامیاب ہے آج
وطن بخیر، وطن پر نیا شباب ہے آج

لطافتِ چمنستانِ روزگار رہو تم — حفاظتِ گل و لالہ کے ذمہ دار رہو تم
عجب نہیں جو بڑھے تم سے گرمیٔ محفل — فروغِ محفلِ رفتہ کی یادگار رہو تم
اگر ہو نالہ کناں، اک مہیب طوفاں ہو — اگر ہو نغمہ فشاں، صورِ رہگزار رہو تم
جو آفتاب پہ چھا جائے تم وہ ذرہ ہو — جو تابِ برق کو شرمائے وہ شرار رہو تم
ترقیوں کا گرجتا ہوا ہو تم بادل — لطافتوں سے مہکتی ہوئی بہار رہو تم
ہے ایک کھیل پہونچنا تمہارا منزل پر — رکاب جس کی ہوا ہے وہ شہسوار رہو تم
بھڑک رہا ہے تمہاری رگوں میں سوزِ حیات — ابھی جو گرم ہے وہ خونِ لالہ زار رہو تم

تمہارے حوصلوں پر اعتبار کر کے چلے
تمہیں سپرد ہم اپنی بہار کر کے چلے

میں نے کل اک پھول سے پوچھا کہ اے مستِ نمو!
نوجوانانِ چمن سے کیوں کھچا رہتا ہے تو؟

عرش سے موتی برستے ہیں ترے اوراق پر
روشنی پڑتی نہیں لیکن ترے اخلاق پر

سر ہلا کر یا تو وہ موتی گرا دیتا ہے تو
یا انھیں خورشید کے آگے بڑھا دیتا ہے تو

جمع کرتے ہیں جو سرمایہ ستارے رات بھر
تو ملا دیتا ہے اس کو خاک میں وقتِ سحر

بوسہ لیتی ہیں اگر بوندیں بگڑ جاتا ہے تو
اپنے اورنگِ تجمل پر اکڑ جاتا ہے تو

جب صبا آغوش میں لے کر جھلاتی ہے تجھے
سر جھکا لیتا ہے جھوٹی شرم آتی ہے تجھے

کنجِ زنگا رنگ میں گم صم پڑا رہتا ہے تو
بات سنتا ہے کسی کی اور نہ کچھ کہتا ہے تو

کیوں نہیں تو آتشِ ہنگامہ آبادِ چمن؟
اے اسیرِ رنگ و بو اے شمعِ آزادِ چمن!

ہے فضا صد حشر در بر تو تغافل کوش ہو
عندلیب افسانہ بر لب اور تو خاموش ہے

درد خواہِ کیستی و داد خواہِ کیستی؟
ایں چنیں رنجیدہ رنجیدہ نگاہِ کیستی؟

ہنس کے بولا پھول اے شکوہ طرازِ خامشی!
آج تک تجھ کو نہیں معلوم رازِ خامشی

یہ مرا حُسنِ متانت، شرطِ آب و رنگ ہے
ورنہ میرے ضبط سے خود ظرف میرا تنگ ہے

میں نہ شبنم کے اگر موتی گرا دوں خاک پر
چاند تاروں میں ہو کیوں عظمت مری افلاک پر؟

خندہ بر لب بوسہ باراں سے گر ہو جاؤں میں
موسمِ بے ابر میں کیوں مسکرانے پاؤں میں؟

باغ میں جو سر کشیدہ شاخ پر رہتا ہوں میں
دستِ گلچیں سے یقیناً بے خطر رہتا ہوں میں

اپنی عطریت کا گر میں خود نہ اندازہ کروں
کس طرح تیرے مشامِ روح کو تازہ کروں

گر نہ سمجھوں ہر ورق کو اپنے عنوانِ بہار
مجھ سے کیوں مانوس ہو زلفِ پریشانِ بہار

آتشِ گلشن ہوں اپنی گرمیٔ پُر جوش سے
سب یہ ہنگامے ہیں میرے جلوۂ خاموش سے

ملتفت دُنیا مرے آئینِ بے زاری سے ہے
کیفِ نظارہ اسی پندارِ خود داری سے ہے

خود نمائی کا گلہ برحق، مگر یہ عرض ہے
اپنی عزت خود کروں، یہ بھی تو میرا فرض ہے

کسی کی یاد میں

دَورِ صیاد میں اس درجہ ہوا غم مجھ کو
کبھی ہوتی ہے خوشی بھی، تو بہت کم مجھ کو

ہم نفس میری بلا سے جو بہار آئی ہے
زندگی میں ہے فقط، فرصتِ ماتم مجھ کو

اپنے بچھڑے ہوئے احباب کا ہوں نوحہ سرا
بزمِ عبرت ہے طرب خانۂ عالم مجھ کو

ہے ابھی پیشِ نظر رخصتِ یارانِ چمن
ابھی رونا ہے بہت صورتِ شبنم مجھ کو

آج خالی ہیں وہ شاخیں جو کبھی تھیں گل ریز
نظر آتا ہے یہ فردوس جہنم مجھ کو

صحنِ گلشن میں وہ ہنگامۂ پرواز نہیں
ساز موجود ہے، ہیدا مگر آواز نہیں

باغباں نظمِ غلط سے ہے پریشان ہنوز
آشیانوں میں سکوں کا نہیں سامان ہنوز

پتّے پتّے پہ ہے طاری وُہی ہیبت ابتک
ذرّے ذرّے میں بپا ہے وُہی طوفان ہنوز

منزل اک قافلۂ نو سے پریشاں ہے ابھی
قافلہ ندرتِ منزل سے ہے حیران ہنوز

نازشِ رفتہ کے آثار کہاں ہیں پیدا؟
غلطی خیز فضائیں ہیں پشیمان ہنوز

ایک موہوم سی امید بر آئی ہے، مگر　　دلِ افسردہ میں باقی ہیں کچھ ارمان ہنوز

کہیں گل ہیں، کہیں گلچیں ہے، کہیں مالی ہے
ابھی صدرِ چمنستاں کی جگہ خالی ہے

یعنی وہ بلبلِ شوریدہ وہ آوازِ چمن　　رنگ افروزِ چمن، زمزمہ پردازِ چمن
نغمہ بر لب ابھی گلشن میں کہاں پہونچا ہے　　ابھی خاموش ہے بھونکی طرح سازِ چمن
جس کے دل میں ہو وفاؤں کی امانت اب تک　　جس کے سینے میں ہے محفوظ ابھی رازِ چمن
جانبِ صحنِ چمن پھر وہ بصد ناز آئے　　اُس کے قدموں پہ جھُکے خانہ براندازِ چمن
اُس کے نغموں سے منظم ہو چمن از سرِ نو　　پھر ہوں یارانِ چمن حاملِ اعزازِ چمن

باز از جلوۂ ادکیفِ نظر تازہ کنم
تا بوجد آیم و بتریکِ دگر تازہ کنم

اے چراغِ صبح سُن!

اے چراغِ صبح، افسانہ فروزِ انجمن — اے مرے دل سوز، اے تصویرِ سوزِ انجمن

لے گیا کوئی تماشائے مسرت لُوٹ کر — پڑ گئی پھیکی ادائے سینہ دوزِ انجمن

میرے دل پر بھی ہے داغِ برہمیِ بزمِ عیش — آہ! میں بھی تھا شریکِ تیرہ روزِ انجمن

ہر جلیسِ بزم سرخوش تھا مئے دوشاب سے

اور تُو ضو ریز اپنے جلوۂ شب تاب سے

آہ میں آگاہ کب تھا اس طلسمِ راز سے — بے خبر تھا گردشِ چرخِ ستم انداز سے

پردۂ چشمِ تماشا بن گئی حیرت مری — ہو گئے غارت وہ جلوے جلوہ گاہِ ناز سے

صبح ہو تو خونِ دل آنکھوں میں بھر بھر کر پیوں — کیا یہی مطلب تھا دورِ بادۂ شیراز سے؟

ساغرستانِ طرب میں شورِ ناؤ نوش تھا

مدعی سب ہوش میں تھے اور میں بیہوش تھا

سب ہوئے اس بزمِ عشرت میں ہم آغوشِ نشاط — اور محویت رہی میری اثر پوشِ نشاط

مجھ کو رکھا قسمتِ تشنہ نے محرومِ نشاط — عام تھی گو مستیٔ صہبائے سرجوشِ نشاط
تیرگی قسمت کی یوں طاری نہ ہو جاتی اگر — خوب تھی فردائے اضمحلال سے دوشِ نشاط

اب تو یادِ وقتِ رفتہ، زحمتِ احساس ہے
آنکھ پر ہے دامنِ ترا ور صبحِ یاس ہے

ہم نشیں، میں تجھ سے وجہِ سرگرانی کیا کہوں؟ — آہ! اپنا حال اپنی ہی زبانی کیا کہوں؟
خوف ہے میری طرح تو بھی نہ پھنک جائے کہیں — آتشیں افسانۂ سوزِ نہانی کیا کہوں؟
داغ جو دل پر نمایاں ہیں انھیں کو دیکھ لے — اور جل بجھنے کی اپنے میں کہانی کیا کہوں؟

رہ گیا ہوں یادگارِ کاروانِ سوختہ
آہ، اک نقشِ فسردہ، اک نشانِ سوختہ

مجھ سے برگشتہ رہا وہ آئینہ آرائے بزم — مجھ تک آنے بھی نہ پایا، پھر گیا مینائے بزم
میری محرومی پہ تھے ارکانِ محفل خندہ زن — قسمتِ محروم نے مجھ کو کیا رسوائے بزم
ہیں مثالِ قیس، شوریدہ سرِ امیدِ دید — اور صد گونہ نگاہی ہیں نہاں لیلائے بزم

لطفِ ساقی بیکراں تھا کیف عالمگیر تھا
میں ہی صرف اس بزم میں آزردۂ تقدیر تھا

اس کے دستِ ناز تھے مصروفِ پیمانِ وفا — ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے تشنہ کامانِ دفا

تھی بہت ارزاں، جسے کہتے ہیں جنسِ دلدہی ۔۔۔ جمع تھا ہر گوشۂ محفل میں سامانِ وفا
تھے حریفوں کے لئے ساغر نگاہِ مست کے ۔۔۔ اور میں سردر گریباں مرثیہ خوانِ وفا

وہ سماں تسکیں دہِ ہر خاطرِ آزاد تھا
اور میں باایں ہمہ برباد تھا ناشاد تھا

سرد ہے وہ انجمن، جو تھی حق و باطل فروش ۔۔۔ لے گئے حصّہ بقدرِ ذوق و قسمت، دل فروش
عیش منزل ہے رہینِ ظلمت و بے رونقی ۔۔۔ ہو گیا نظروں سے پنہاں جلوۂ منزل فروش
کون ہے اب کس سے سودائے محبت کیجئے؟ ۔۔۔ آہ، باقی ہے وہ محفل، اور نہ وہ محفل فروش

جنسِ من صرفِ حریفاں شد، خریداری کجا
یوسفم ہمراہِ گرگاں، گرمِ بازاری کجا

تضمین بر رباعیاتِ خیام

گھنگھور سی اک مست گھٹا چھائی ہو
سرسبز کوئی مقامِ صحرائی ہو
دنیا میں یہی ہے زندگی کا حاصل
شاہد ہو شراب ہو شکیبائی ہو

ساقی ہو وہی جو مست و بیخود کر دے
رنگین لبوں سے بادہ کوثر دے
جب دیکھ لے میکشِ محبت کی طرف
مستیِ نگاہ سے صراحی بھر دے

جب حسنِ ازل ہو جلوہ گر آنکھوں پر
اور کیفِ شباب کا اثر آنکھوں پر
یہ حرمتِ نظّارہ ہے اے اہلِ نظر
دل پر رہے ہاتھ اور نظر آنکھوں پر

عادت ہی نہیں تو شادماں کیا ہوگا
مسرورِ طرب گاہِ جناں کیا ہوگا
عقبیٰ ہے خمارِ کیفِ دنیا غافل
جب کچھ نہ ہوا یہاں وہاں کیا ہوگا

ہو کر آزاد عیش و عشرت کر لیں حاصل مے و محبوب سے راحت کر لیں
کرتے رہیں انتظارِ جنت کب تک؟ ہم اپنی ہی دنیا کو نہ جنت کر لیں!

گویند بہشت و حورِ عیں خواہد بود
وانجا مےٗ ناب و انگبیں خواہد بود
گر ما مے و معشوق پرستیم رواست
چوں عاقبتِ کار چنیں خواہد بود (خیّام)

جب یاد تصوّر میں تری آتی ہے جلوے دلِ بیدار پہ برساتی ہے
نظروں میں مری وادیٔ ایمن کی طرح بجلی اک کوندتی ہے چھپ جاتی ہے

بے پردہ ہوا نشاطِ عالم ہو کر جھوما نظروں میں کیف اور رم ہو کر
آخر اسی آلودہ صراحی سے مری نکلا کوئی مستیٔ مجسّم ہو کر

کیا فرض ہے یہ کہ وہ تجھی کو دیکھے تیری ہی نگاہِ ملتجی کو دیکھے
دستورِ تماشا تو یہ ہے اے خود بیں تو دیکھ اُسی کو، وہ کسی کو دیکھے

غرقِ انوارِ جلوہ گر ہو جائے — اپنی ہستی سے بے خبر ہو جائے
نظارہ اُسی کا ہے جو وقتِ دیدار — خود دیکھتے دیکھتے نظر ہو جائے

ہو محوِ جمال آنکھ والا ہے وہی — جو سامنے بیٹھا رہے شیدا ہے وہی
وہ طور ہے، ہو جہاں کوئی جلوہ نما — جھیلے جو نظر کی چوٹ موسیٰؑ ہے وہی

اے دیدہ بیا لقائے منظور ببیں
آں جبہۂ وآں جمال وآں نور ببیں
در وادیِ ایمنِ محبّت بگذر
ہم موسیٰ وہم درخت وہم طور ببیں (خیام)

دعوتِ فکر و غور

کبھی کیا اس پہ غور تو نے، یہ خاکدانِ خراب کیا ہے؟
یہ صبح کو ارتحال کیوں ہے، یہ رات کا انقلاب کیا ہے؟

تغیرات اور علی التواتر، تحوّلات اور بے محابا
کمالِ حسن و جمال کیا ہے، زوالِ شیب و شباب کیا ہے؟

ہے آدمی جلوہ دار کس کا، یہ خاک ہے پردہ دار کس کی؟
یہ روح یعنی حیات کیا ہے؟ یہ جسم یعنی نقاب کیا ہے؟

یہ نغمے کیوں حشرِ سامعہ ہیں، خمار کیوں ہے مآلِ مستی؟
سرود میں یہ صدا ہے کیسی، نوائے چنگ و رباب کیا ہے؟

بہار کی اصل و بود کیا ہے، ہیں رقص میں آبشار کب سے؟
ہے سرحدِ رنگ و بو کہاں تک طلسم زارِ حباب کیا ہے؟

یہ موت اور یہ حیاتِ فانی، ہے کس کا قانونِ جاودانی
جو روز ہوتی ہے تجھ پہ طاری وہ مست ترکیبِ خواب کیا ہے؟

یہ کیوں درخشندہ ہیں کواکب یہ سماں کیوں ہو گردشوں میں

ہے مہر میں التہاب کیسا، یہ جلوۂ ماہتاب کیا ہے؟

ہے چیستاں کارزارِ ہستی، مگر ہے ہر ذہن مائلِ حل

یہ کاوشِ بے شمار کیوں ہو وہ شورشِ بے حساب کیا ہے؟

نکل کے اجسام سے یہ روحیں کدھر چلی جا رہی ہیں لاکھوں؟

تعینِ روزِ حشر کیوں ہے، سیاستِ احتساب کیا ہے؟

تو محوِ سائنس و فلسفہ ہے حریمِ فطرت کا راز ہو کر

سمجھ حقیقت نظامِ ہستی کی بے نیازِ مجاز ہو کر

مجاز و حقیقت

صبح و شامِ چمنستانِ فنا پردہ ہے
رنگ و بو، تیرگی و نور و ضیا پردہ ہے

خلوتِ ذرۂ خاکی ہے حجابِ اکبر
وسعتِ انجمنِ ماہ و ثریا پردہ ہے

اور ہے مطربِ ساقی میں کوئی کیف و صدا
نغمۂ و نالۂ ہر ساز و نوا پردہ ہے

ہے اسی باطنِ ہستی میں حقیقت پنہاں
یعنی دنیا یہ تمام ایک سرا پردہ ہے

جلوہ گاہے دگر و لالہ ستانے دگر است
پسِ ایں پردۂ صد رنگ جہانے دگر است

طور کی چوٹی پر

چمک اے برقِ عالم سوز، یہ پردہ کشی کیسی؟
تپش آلودۂ حسرت سے برہم خاطری کیسی؟

حجابِ شرم اور وہ بھی نظر بازانِ معنی سے!
ہوئی جب ملتفت اکبار تو پھر بے رخی کیسی؟

چمک کر تیرا چھپنا جس نے دیکھا اُس نے دیکھا تھا
ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تابش ہے تری کیسی؟

تری فطرت میں طوفانِ سرورِ نور سنتے ہیں
تو پھر یہ طور پر تاریکی و افسردگی کیسی؟

کلیم اللہ پر کیا ختم تھا نطقِ کلیمانہ؟
یہ بزمِ عشق پر چھائی ہوئی ہے خامشی کیسی؟

وداعِ ہوش کی پروا نہ کر، جلوہ گری فرما
ابھی سے ہوش جب ہم میں نہیں پھر بیہشی کیسی؟

ہمیں بھی کر تپش اندوز اے برقِ شرار افگن
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تجھ میں ہے غارتگری کیسی؟

مثالِ ابنِ عمراں، طالبِ دیدار ہم بھی ہیں
جلا دے، خاک ہونے کے لئے تیار ہم بھی ہیں

یہ وادی، یہ بیاباں، اور یہ ایمن کی تنہائی
امیدِ سوختن کس عالمِ حیرت میں لے آئی

یہ چوٹی طور کی جو یادگارِ عہدِ موسیٰؑ ہے
کھچی جاتی ہے آنکھوں میں بایں دیرینہ رعنائی

نظر آتا نہیں میرے سوا نظارگی کوئی
کبھی میں خود تماشا ہوں، کبھی میں خود تماشائی

لگانا چاہتا ہوں سارے کوہِ طور کا سرمہ
بڑھانا چاہتا ہوں دیدۂ حسرت کی بینائی

تمنا ہے کہ اس منظر کو اپنے ساتھ لیجاؤں
مرے دامن کی تنگی دیکھ اور اس کی پہنائی

مری آوارہ گیتی حاملِ ذوقِ تجلّی ہے
نہ میں وحشی نہ دیوانہ، نہ سودائی نہ صحرائی

خرابِ حسن ہوں میں جس طرح چمکے جہاں چمکے
فدائی اک جھلک کا، ایک جلوے کا تمنائی

سوادِ یاس کی تاریکیٔ شبگیر چمکا دے
میں ہوں سرگشتۂ ظلمت مری تقدیر چمکا دے

کلیسا میں تجھے ڈھونڈا، حرم میں بھی تجھے ڈھونڈا
برہمن بن کے ہر بیت الصنم میں بھی تجھے ڈھونڈا

بہت کی دردمندوں کے دلوں میں جستجو تیری
حسینوں کی نگاہِ پرستم میں بھی تجھے ڈھونڈا

وفا والوں کے سامانِ وفا میں بھی تجھے دیکھا
عطا والوں کے دامانِ کرم میں بھی تجھے ڈھونڈا

سنے نغمے ہزاروں سب وہ لیکن تجھ سے خالی تھے
نوائے مطرب کے زیر و بم میں بھی تجھے ڈھونڈا

لیا تیری طلب میں جائزہ سب کے خیالوں کا
نگارستانِ اربابِ قلم میں بھی تجھے ڈھونڈا

شریکِ عیش ہو کر، شاملِ بزمِ عزا ہو کر
خوشی میں بھی تجھے ڈھونڈا الم میں بھی تجھے ڈھونڈا

وفورِ جستجو نے کر دیا اس درجہ کا بیہدہ
کہ دامانِ نسیمِ صبح دم میں بھی تجھے ڈھونڈا

بالآخر طور پر مجھ کو ہوائے آرزو لائی
سوادِ مشرقِ رنگ و نوا تک جستجو لائی

چمک اے برقِ ایمن اور جذبِ یک شرر کر دے
لگی دل کی بجھا دے آ مجھے شعلہ بسر کر دے

نظر کی آرزو یہ ہے کہ ممنونِ تجلّی ہو
تجلّی کو خدارا آج مشکورِ نظر کر دے

زمانہ ہو چکا، ہے طور کا ماحول افسردہ
فروزاں پھر یہاں خاکسترِ قلب و جگر کر دے

بیک رنگینِ تجلّی و بہ یک ضو ریزیِ تازہ
مرے طولِ امل کی داستاں کو مختصر کر دے

نگاہِ تشنہ میں بھر دے شرابِ حیرتِ جلوہ
خودی سے تنگ ہوں، بیخود بنا دے بیخبر کر دے

جمودِ طورِ سینا چاہتا ہے بے سکوں ہونا
جسے سرمہ کیا تھا، پھر اُسے زیر و زبر کر دے

بصد انداز کر اندازِ رعنائی کو بے پردہ
مجھے ہمرنگِ موسیٰؑ محوِ کوہِ طور پر کر دے

مرے سوزِ دروں سے جلوہ گاہِ نور پیدا کر
ہر اک ذرّے سے میری خاک کے سو طور پیدا کر

حُسن

"حُسن" ہے اک رازِ فطرت، جو نہیں عریاں ہنوز
علم اس کا ہے خدا کے ذہن میں پنہاں ہنوز

حُسن کے لاکھوں فسانے ہو گئے صَرفِ قلم
اور حقیقت نے چھُوا تک بھی نہیں عنواں ہنوز

حُسن کی زلفوں سے ہے نیرنگیٔ شامِ ابد
حُسن کی کرنوں سے ہے صبحِ ازل رخشاں ہنوز

تو زوالِ حُسن بھی ممکن سمجھتا ہے۔ مگر
حُسن ہے وجہِ قیامِ عالمِ امکاں ہنوز

حُسن نے ہر دَور کو دی ہے بقائے جاوداں
اور تو فانی سمجھ کر اس کو ہے نالاں ہنوز

فطرتِ مطلق پہ غالب ہو قضا، ممکن نہیں
حُسن ہی فطرت ہے، فطرت کو فنا ممکن نہیں

باغ فانی ہے مگر، نشو و نمو فانی نہیں
پھول فانی ہیں مگر پھولوں کی بو فانی نہیں

آرزو رہتی ہے باقی آرزو مندوں کے بعد
دل فنا آگیں ہے دل کی آرزو فانی نہیں

چند قطروں کے تموّج سے نہیں کچھ آبرو
خشک ہونے پر بھی شانِ آبجو فانی نہیں

جستجو کا سلسلہ ہے کارواں در کارواں
راستے فانی ہیں، ذوقِ جستجو فانی نہیں

"روح" سے ہے "تو" عبارت، روح ہی عینِ بقا
تیرا پیکر ہے فنا بر دوش، "تُو" فانی نہیں

موت اس کے پاس ہو کر بھی گزر سکتی نہیں
یعنی فطرت راز بن سکتی ہے مر سکتی نہیں

حُسن جب پیکر میں اپنی جلوہ ارزانی کرے
اس سے کہہ دو اس امانت کی نگہبانی کرے

حُسن کو فانی سمجھ کر ہو نہ اس سے بے نیاز
بلکہ تدبیرِ بقائے ہستیٔ فانی کرے

حُسن کے پرتو سے بن کر ایک صبحِ نوربار
ہو سکے تو سارے عالم میں درخشانی کرے

اے امینِ حُسن، قدرِ حُسن کرنی چاہیے
ہے وہی یوسف جو سعیٔ پاک دامانی کرے

کر یقیں، اپنا نشیمن حُسن کو یاد آگیا
پیکرِ فانی سے جب عزمِ پرافشانی کرے

آمد و شد سے مسلسل گرمِ راہِ حُسن ہے
حسن لافانی ہے، فانی سیرگاہِ حُسن ہے

شاعرِ امروز

ہوشیار اے شاعرِ شیوہ بیاں، نازک خیال
ہے گرفتِ پنجۂ تنقید میں تیرا کمال!

آ میں دیکھوں کیا ترا سرمایۂ افکار ہے؟
آ میں پرکھوں شاعری کا تیری کیا معیار ہے؟

اے کہ تو تقلید کے دھوکے میں ہے آیا ہوا
دل ہے تیرا ظلمتوں میں پرورش پایا ہوا

ہے قدامت کا بھنور گھیرے ہوئے تیرا دماغ
تو ابھی چقماق سے اپنا جلاتا ہے چراغ

ہے جبیں تیری نقوشِ نو سے مصروفِ گریز
کاروانِ رفتہ کے دھندلے قدم پر سجدہ ریز

عہدِ برقی میں تو اب تک شمع کا پروانہ ہے
ایک فرضی قمقمہ تیرا چراغِ خانہ ہے

اُڑ چکا بلبل بہت مدت ہوئی ایران سے
روپ میں اُس کے جھلکتا ہے تو ہر عنوان سے

تو کبھی صیاد کے دامِ بلا کا ہے شکار
اور کبھی ہے گھونسلے میں سرخوشِ فصلِ بہار

رنگ و بو کی دلفریبی میں گھرا رہتا ہے تُو
آدمی کے بھیس میں طائر بنا رہتا ہے تُو

قبرِ لیلےٰ، گورِ مجنوں ہو چکے جزوِ زمیں
تو سمجھتا ہے انھیں صحرا مکیں محمل نشیں

کوہکن کی لاش تیرے سامنے ہے بے کفن
کھودتا ہے تو گڑے مردے ابھی اے گورکن!

انقلاب آئے کئی دُنیا کی صبح و شام میں
تو ابھی ہے محوِ ہجر و وصل کے اوہام میں

تو بھی ہے ناکام، تیری فکر بھی ناکام ہے
سچ بتا اس شاعری کا تیری کیا انجام ہے؟

باش، اے کذاب لے بہروپئے، باطل پرست!
میں ترے پندار کو دیتا ہوں پیغامِ شکست

آ، ادھر آ، کھول آنکھیں سامنے ہے آئینا
دیکھ اس میں رنگ اپنے ملک کا اور قوم کا

کیا کبھی لکھا ہے تو نے ان پہ کوئی مرثیا؟
کیا ہوا ہے تو کبھی ان کے لئے نوحہ سرا؟

کیا ہے کوئی شعر تیرا، ترجمانِ دردِ قوم؟
تو نے کیا منظوم کی ہے داستانِ دردِ قوم؟

تو کبھی محفل میں آیا ہے رجز گاتا ہوا؟
گونجتا، گاتا، گرجتا، آگ برساتا ہوا؟

اپنے سوزِ دل سے گرمایا ہے سینوں کو کبھی؟
تر کیا ہے آنسوؤں سے آستینوں کو کبھی؟

دردِ ملت کی کبھی سینے پہ برچھی کھائی ہے؟
چاندنی راتوں میں بیداری کی دولت پائی ہے؟

قوم کے غم میں کیا ہے خون کو پانی کبھی؟
رہگزارِ جنگ میں کی ہے حدی خوانی کبھی؟

حشر اٹھایا ہے کبھی اک نغمۂ بیتاب سے؟
کیا ربابِ دل کو چھیڑا ہے کبھی مضراب سے؟

کیا کوئی مطلع کہا ہے قابلِ شانِ وطن؟
کیا کوئی تشبیب سوچی ہے بعنوانِ وطن؟

کیا رلایا ہے لہو تو نے کسی مضمون سے؟
نظمِ "آزادی" کبھی لکھی ہے اپنے خون سے؟

کیا کسی کا دل پسیجا ہے ترے اذکار سے؟
کیا کبھی شعلے تراشے ہیں لبِ گفتار سے؟

اے پرستارِ قدامت، عبرت ذہنگِ سخن، | بیٹھ نقالوں کی صف میں چھوڑ راہ و رنگِ سخن
میں ترے "جانِ غزل" جذبات کا قائل نہیں | صاف کہتا ہوں کہ یہ مسند ترے قابل نہیں
شاعری، پیغمبری کا جزو کہتے ہیں جسے | کیا ملا ہے اس میں کوئی واقعی حصہ تجھے؟
کیا قیودِ دلکشی کو ترک کر دیتا ہے تو؟ | کیا کبھی بے فکر کے بھی شعر کہہ لیتا ہے تو؟
درد آلودہ جو لب تک شعر آتا ہے کبھی | ٹھیس سے اُس کی ترا دل چوٹ کھاتا ہے کبھی؟
کیا براہِ راست تو مُلہم سے ہے الہام کوش؟ | کیا تجھے قبلِ سحر آتی ہے آوازِ سروش؟
کیا چھڑکتا ہے کوئی کوثر ترے انفاس پر؟ | کیف کی ہوتی ہے کیا بارش ترے احساس پر؟
کیا میسر ہیں تجھے انگڑائیاں تخئیل کی؟ | کیا صدا تو نے سنی ہے شہپرِ جبریلؑ کی؟

کیا کبھی باطل سے حق کی تو نے کی ہے جستجو؟ | کیا رگِ گل سے ترے دامن میں ٹپکا ہے لہو؟
کیا کبھی بدلی میں دیکھے ہیں ستارے ضو فشاں؟ | خاک سے بھی کیا کبھی چمکی ہیں تجھ پر بجلیاں؟
شام کی تصویر کھینچی ہے سحر کے نور سے؟ | تجھ کو آئی ہے کبھی بوئے کفن کافور سے؟
چاند کی کرنوں سے کیا تو ہو چکا ہے ہمکلام؟ | ساغرِ خورشید میں پی ہے شرابِ لالہ فام؟
قطرۂ شبنم سے پھولوں کے ورق پر تو نے کیا | طرح کا مصرع کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا؟
سوزِ دل کا تازہ کلیوں سے کیا ہے اکتساب؟ | آگ سے تو نے نچوڑا ہے کبھی عطرِ گلاب؟

پردۂ اسرار کی محرم ہے کیا تیری نگاہ؟ — کیا حریمِ عرش سے ہے آشنا تیری نگاہ؟

کیا حقیقت سے کبھی محرم ہوا تیرا مجاز؟ — کیا پڑھی ہے تو نے چوکھٹ پر شوالے کی نماز؟

کیا وضو تو نے کیا ہے بادۂ سرجوش سے؟ — لی ہے کیا تعلیم پتھر کے لبِ خاموش سے؟

کیا کبھی اُٹھا ہے تیری مجمرِ دل سے دھواں؟ — شعر خیز و نغمہ ریز و نطق بیز و نظم خواں

شعر کی لذت سے ہو جاتا ہے تو مجروح کیا؟ — شعر کہنے سے تڑپ جاتی ہے تیری روح کیا؟

اے سخن دشمن اگر حاصل نہیں یہ مرتبا — خون کیوں کرتا ہے پھر بکواس سے الفاظ کا؟

درد کا حامل نہیں اسرار کا ماہر نہیں

آج میں اعلان کرتا ہوں کہ تو شاعر نہیں!

اساسِ کائنات

بیخودی میں کل کسی آزاد نے کہدی یہ بات ہے محبت ہی سے پردہ داریٔ رازِ حیات

ہیں یہ دونوں آبِ رنگِ مہر سے سینچی ہوئی سبزہ زاروں کی سحر ہو یا سمن زاروں کی رات

ہے محبت برہمیٔ دہر کو روکے ہوئے ورنہ تھا اس کا الٹنا از قبیلِ ممکنات

ہیں اسی سے بزمِ کیف و وجد کی سرمستیاں اور ہے قید الم میں ہر نفس اس کا نجات

عشق کی گرمی اسی سے اخذ کرتی ہے سکوں حُسن کی نظروں کو دیتی ہے رنگِ التفات

ہو کوئی سلطان، یا مزدور، یا صحرا نشیں مرحمت کرتی ہے سب کی زندگی کو یہ ثبات

ہے اسی سے روح پرور نغمۂ نے کی صدا انجمن میں ہے یہ مضرابِ ربابِ حسیات

مو قلم میں کارفرما ہے مصور کے یہی ذہنِ شاعر میں اسی سے ہے نزولِ واردات

عالمِ ہستی کی یہ مضبوط اک بنیاد ہے یعنی قائم ہے محبت پر اساسِ کائنات

مرحبا بر جانِ او، صد سجدہ ہا بر نامِ او

او خدائے ما ست وما بندۂ بے دامِ او

اپنی ہر رگ میں شرارِ آرزو رکھتا ہوں میں — برق سے بہتر مذاقِ جستجو رکھتا ہوں میں

سرخوشی کونین کی میرے ہی میخانے سے ہے — مذہبِ پیمانہ و جام و سبو رکھتا ہوں میں

میرے اوراقِ پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ — ہر ورق میں اک جہانِ رنگ و بو رکھتا ہوں میں

میں نمازِ شام پڑھ سکتا ہوں سطحِ بحر پر — سیل میں بھی ہمتِ غسل و وضو رکھتا ہوں میں

میں وہی قطرہ ہوں، جو ہے جاذبِ کل کائنات — وسعتِ قلزم کو رہنِ آب جو رکھتا ہوں میں

روح میری ہے تناور دل مرا طوفاں شناس — موج کو تیر سے زیادہ آبرو رکھتا ہوں میں

بسکہ میرے سامنے ہے جلوہ گاہِ شش جہات — بزمِ عالم میں نگاہیں چار سو رکھتا ہوں میں

ہے مجھے سیرِ دو عالم پر مجالِ اختیار — آئینہ دل کا ہمیشہ روبرو رکھتا ہوں میں

ہو گئے ہیں چاک لاکھوں میرے دامن میں تو کیا — ہر نظر میں قوتِ تارِ رفو رکھتا ہوں میں

آبگینوں میں مری آنکھوں کے ہے عطرِ بہار — جذب ان میں لالہ و گل کا لہو رکھتا ہوں میں

میرا مٹ جانا بھی ہے سیماب میری زندگی
اپنی خاکستر میں سامانِ نمو رکھتا ہوں میں

(ایک تصویر دیکھ کر)

یہ کون خلوت کدے کے پردے اُلٹ کے جلوے دکھا رہا ہے؟
یہ کس کا، کافرِ شبابِ رنگیں شفق کا خاکہ اُڑا رہا ہے؟
یہ کس کے ہنگامۂ تصور سے ہے خموشی فضا پہ طاری؟
خیال کی قوتوں سے یہ کون دل کی دُنیا ہلا رہا ہے؟
یہ کس کی آرائشوں نے جنت کی ایک تصویر کھینچ دی ہے؟
بہارِ رنگ و سرور بن کر یہ کون منظر پہ چھا رہا ہے؟
مجسّم اک پیکرِ تجلّی، پھر اُس پہ شرم و حیا کا زیور؟
برس رہی ہے بھری جوانی، شباب موجوں پہ آ رہا ہے؟

نہ کوئی غمّاز و نکتہ چیں ہے
نہ کوئی ہمراز و ہم نشیں ہے

سکوت کی انتہا نہیں ہے
کسی کی آواز بھی کہیں ہے؟
مگر کسی کا خیال دل کی زبان سے کچھ سنا رہا ہے

حسین دیوی یہ ہے وفا کی، وفا یہ کرتی ہے دل لگا کر
یہ محو ہے یاد میں کسی کی، خموش بیٹھی ہے سر جھکا کر
یہ نامۂ شوق و آرزو میں شکایتیں غم کی لکھ رہی ہے
گزارشِ حال کر رہی ہے وفورِ جذبات کو دبا کر
جھکی ہوئی ہیں نشیلی آنکھیں، لڑی ہوئی ہیں قلم سے نظریں
ردا جو سر سے ڈھلک گئی ہے رُکی ہے دوشِ حسیں پہ آکر
ہے غرقِ محویتِ تخیّل، نہیں ہے ہوش اپنے تن بدن کا
یہ خود ہی کاغذ پہ بہ رہی ہے روانیٔ فکر میں سما کر

تکلّم اس کی نظر سے عریاں
تبسّم اس کے لبوں میں پنہاں
جبیں سے شانِ وفا درخشاں
نشست سے تمکنت نمایاں

کسی سے در پردہ گفتگو ہے کسی کو پیغام جا رہا ہے

یہ دستِ نازک سے لکھ رہی ہے کسی کو ذوقِ وفا کی باتیں
قلم سے اس کے ٹپک رہی ہیں، طلب کی بوندیں حیا کی باتیں
یہ لکھ رہی ہے کہ "تم تو جاتے ہی اپنی...... کو بھول بیٹھے
"وہ شام رنگیں کے عہد و پیماں، بہار و ابر و ہوا کی باتیں"
یہ لکھ رہی ہے کہ "منتظر ہیں تمہارے حُسنِ قدم کی ہوں"
"پیام آمد کا روز دیتی ہے۔ ہائے بادِ صبا کی باتیں"
یہ لکھ رہی ہے کہ "ہم تو بے چین رات دن غم میں ہیں تمہارے"
"تمہیں بھی ہیں یاد یا نہیں ہم؟ خدا ہی جانے خدا کی باتیں"

وہ راحتیں ہو گئیں کہانی
اُداس رہنے لگی جوانی
تمہیں سے ہے میری شادمانی
تمہیں تو ہو وجہِ زندگانی

تمہیں صدا دے رہی ہے کوئل تمہیں پپیہا بُلا رہا ہے

شاعر کا نصب العین[1]

جب روح محوِ خواب ہو، جب خواب سُکر آمیز ہو
جب ہو جمود آگیں فضا غفلت کی مستی تیز ہو

اک مستقل آزار ہو جب انتشار افراد کا
جب شورشِ ایّام کا سیلاب طوفاں خیز ہو

پھیلی ہوئی ہو جب وبا دنیا میں استبداد کی
جب ہر نفس ہو مضطرب ہر آنکھ اشک انگیز ہو

جب نشترِ احساس خود دل کی رگوں کو چھیڑ دے
جب خاطرِ مجروح کا ہر سانحہ خوں ریز ہو

جب آدمی مظلوم ہو اور زندگی مظلوم تر
جب بیکسی کے سامنے فرعون ہو چنگیز ہو

اُس وقت شاعر سے کہو تخئیل کو تکلیف دے
اجزائے نظم و شعر کو پیرایۂ تصنیف دے

شاعر کا فطری فرض ہے دے رفعتیں جذبات کو
تبدیل کر دے صبح میں تاریکیٔ ظلمات کو

پھولوں کے دل میں کھول دے بادِ چمن کے راستے
مربوط کر دے دشت میں بکھرے ہوئے ذرات کو

رشتے فنا کے جوڑ دے سرچشمۂ جاوید سے
رنگِ حیاتِ تازہ دے دنیائے محسوسات کو

نغموں سے اپنے پھونک دے پژمردگی میں تازگی
تجدید کا پیغام دے مایوسیٔ حالات کو

[1] یہ لفظ بفتح نون و صاد صحیح ہے مگر ہندوستان میں عوام اور فصحا بسکونِ صاد بولتے ہیں اور مجاز و محبت کی طرح اس کے اعراب اصلی بھی محفوظ تلفظاً نہیں ہیں۔

اُٹھے اور اپنی مشعلِ تحقیق کو کر دے بلند　　جب حادثوں کے خوف سے تھرّائیں تارے رات کو

چھا جائے انساں زار پر صبحِ نگاریں کی طرح

برسے دلِ بیدار پر الہامِ رنگیں کی طرح

شاعر کے نصب العین میں تہذیبِ عالم عام ہو　　ہر شعر اُس کا وحی ہے، ہر اک نوا الہام ہے

شاعر کے نصب العین میں عزمِ الٰہی ہو نہاں　　اُس کے قلم کی ہر صدا، فطرت کا اک پیغام ہے

شاعر کے نصب العین میں عرفاں کی ہو جبیں بلند　　آغاز اس کی فکر کا آئینۂ انجام ہے

شاعر کے نصب العین میں ہو کامیابی خلق کی　　مقصد میں اپنے اس لئے وہ فطرتاً ناکام ہے

شاعر کے نصب العین میں ہیں دو جہاں کی وسعتیں　　نظروں میں صبحِ عرش اور تحت الثریٰ کی شام ہے

پیدا ہوا ہے خلق کی مشکل کشائی کے لئے

شاعر ہے آوازِ خدا، ساری خدائی کے لئے

شاعر کا نصب العین ہرگز ایک ہو سکتا نہیں　　وہ رندِ کامل ہے کہیں اور مصلحِ اعظم کہیں

جب مست ہو، تو ہمنشیں اُس کا ہو ساقیِ ازل　　جب ہوش میں ہو محفلِ ہستی کا ہے مسند نشیں

مجذوب ہو۔ تو ہو حقیقت فاش اُس کے جذب سے　　سالک ہو وہ تو ہو چراغِ راہ اربابِ یقیں

قائد بھی ہو مرشد بھی ہو عابد بھی ہو زاہد بھی ہو　　کثرت میں لامحدود ہو، وحدت میں ہو خلوت گزیں

وہ حُسن کا شاہد بھی ہو اور عشق کا مشہود بھی　　ساجد بھی ہو مسجود بھی گاہے چناں گاہے چنیں

جو کچھ ہے جیسا ہے، جہاں ہے، حاصلِ کونین ہے

فطرت کا نصب العین گویا اُس کا نصب العین ہے

عشرت کدوں میں نغمۂ شاعر اگر نوروز ہے
ماتم کدوں میں اُس کا ہر آنسو جہان سوز ہے

وہ آخری مقصد ہے سرد و گرمِ رزم و بزم کا
وہ رونقِ ایواں ہے، ہر میدان میں فیروز ہے

صبحِ الٰہیات کا خورشید ہے نور آفریں
شامِ سیاسیات کی وہ شمع نور اندوز ہے

اصنافِ نفسیات میں ایسا کوئی ماہر نہیں
درسِ طبیعیات میں پیرِ جہاں آموز ہے

مردِ تصور ہی نہیں کامل مصور بھی ہے وہ
"فِی کُلِّ وَادٍ" میں اسی کا ذکرِ فکر افروز ہے

قسمت ہوئی روزِ ازل آوارہ تقدیری اُسے

فطرت نے خود تفویض کی شانِ ہمہ گیری اُسے

جس وقت کوئی ساربان عذرِ سبک رانی کرے
اُس وقت شاعر سے کہو آئے حدی خوانی کرے

جب جادۂ اقوام میں دشواریاں ہوں سدِّ راہ
اُس وقت شاعر سے کہو تدبیرِ آسانی کرے

جب گردِ فکر و یاس میں دب جائے سارا قافلہ
اُس وقت شاعر سے کہو سعیِ درخشانی کرے

جب شورشوں کے بعد بھی ممکن نہ ہو اک انقلاب
اُس وقت شاعر سے کہو، خونِ جگر پانی کرے

جب ایک بھی آنسو نہ چشمِ خلق میں باقی رہے
اُس وقت شاعر سے کہو اک نالہ ارزانی کرے

شاعر کو ہر بے چین دل کا چین ہونا چاہیے

اب تک نہیں، تو اب یہ نصب العین ہونا چاہیے

اکثر افسردہ کیا دعوتِ حرماں سے مجھے
شکوہ ہے اپنے تماشائے پریشاں سے مجھے

کیا خبر سینے میں پیوست ہیں کتنے نشتر؟
خون رِستا نظر آتا ہے رگِ جاں سے مجھے

پھول سے ملتی ہے اک تلخ شرابِ انجام
پھانس ہوتی ہو عطا خارِ بیاباں سے مجھے

بیخودی میں جو کبھی میں نے جھکا لیں نظریں
موت نے جھانک لیا گورِ غریباں سے مجھے

سر اُٹھایا تو نیا عالمِ عبرت دیکھا
کچھ ہیولے نظر آنے لگے ویراں سے مجھے

ہے بصیرت پہ حجابِ در و بام آئینہ
دیکھتا ہوں کہ یہ عالم ہے تمام آئینہ

زیرِ دامانِ افق، آہ یہ دھندلے سے نشاں
جنھیں سورج کی شعاعوں نے کیا ہے عریاں

کہیں مینار شکستہ کہیں گنبد برباد
خوف سے اُڑ نہیں سکتا کوئی طائر بھی جہاں

ایسی اک رات کہ جو بعدِ سحر بھی ہو سیاہ
ایک "انبار اندھیرے کا" مہیب و ویراں

شاید اس بزم کی سب ہو گئیں شمعیں خاموش
کہیں ادبار کے بادل، کہیں حسرت کا دھواں

زندگی کی نہیں ضو ریز کہیں چنگاری
صرف ہے راکھ کا اک ڈھیر فضا میں لرزاں

جو مسرت کے محل عیش کا گھر بنتے ہیں
اُنھیں ایوانوں سے دُنیا میں کھنڈر بنتے ہیں

نقصِ ہستی

مری ہستی نہیں کچھ بھی، مگر اے خالقِ ہستی
حقیقت کیوں نہ تجھ پر کھولدوں دنیائے فانی کی؟

حریصِ اسد رجہ فطرت کیوں ہوئی تخلیقِ انساں پر
نہ تھی جب خود ہوس اس کو نشاطِ زندگانی کی

یہ بحرِ آفرینش کا ستم ہے یا عنایت ہے
کہ ملو فانوں میں آکر گھر گئی اک بوند پانی کی

مری مجبوریاں دیکھا ور جبر و اختیار اپنا
بہت صبر آزما ہے آزمائش بے زبانی کی

تجھے یہ فکر پھر محفل میں تیری لوٹ آؤں میں
مجھے باایں ہمہ حسرت حیاتِ جاودانی کی

پے لذت آشنائے جرعۂ آبِ بقا کر دی
زیک جامِ بقا لب تشنۂ دائم مرا کر دی

نظامِ ناقصِ تخلیق کی تکمیل ہو جاتی
اگر انسان دنیا میں نہ مجبورِ فنا ہوتا

مجسّم ہو کے ملتی یار یابی تیری محفل میں
ملا تھا روح کو پیکر تو کیوں اس سے جدا ہوتا

چلا آتا کسی ترکیب سے دُنیا کو سمجھا کر
نہ یہ شورِ فغاں ہوتا نہ یہ ماتم بپا ہوتا

تکلّف برطرف فوراً ہی تیرے پاس آجاتے
زمیں تک عرش سے گر نور کا جھولا پڑا ہوتا

زمیں کیوں بارِ اجسام کے ہوتی پراگندہ
فلک کیوں دیکھ کر یہ سانحے نوحہ سرا ہوتا

غلط راہیست راہِ گوز ہیشِ کاروانِ تو
فنا با جانِ او ہرگز نمی ارزد بجانِ تو

نہ ہو گر تُو خفا تو آج میں یہ بات بھی کہدوں ۔۔۔ زوالِ ہستیٔ انساں کمالِ نقصِ ہستی ہے
نہ ہو کیوں موت پر قادر جو قادر زندگی پر ہو ۔۔۔ طرازِ خلق پر ذہنیّتِ مخلوق ہستی ہے
ہو کوئی پیرہن، مقصود تیرے پاس آنا ہے ۔۔۔ نظر بزمِ ازل کی سیر کو سب کی ترستی ہے
وہ اک قانون جس سے موت کا سا خوف طاری ہو ۔۔۔ خلافِ دلنوازی جذبۂ قوت پرستی ہے
زمیں پر عرش سے آنا زمیں سے قبر تک جانا ۔۔۔ یقیناً موت بعدِ موت ہستی بعدِ ہستی ہے

شکایت نقصِ ہستی می کند حُکمِ تلافی کُن
قوانینِ فنا را رد بہ قانونِ اضافی کُن

دِل کی پیاس

اُس نے آباد کیا عالمِ امکاں میں مجھے
اور اک دل بھی دیا، سینۂ سوزاں میں مجھے

دل میں احساس دیا چین نہ لینے والا
کر دیا جذب اس احساسِ پریشاں میں مجھے

میں نے دیکھا گُلِ رنگیں کو چمن میں بدمست
سبزہ سرخوش نظر آیا چمنستاں میں مجھے

چاند کو نورِ تبسّم سے درخشاں دیکھا
صبح صد رنگ ملی فصلِ بہاراں میں مجھے

جنھیں احساسِ مسرت نہیں وہ وحشی بھی
چوکڑی بھرتے نظر آئے بیاباں میں مجھے

آہ لیکن مجھے یہ کیف ودیعت نہ ہوا
میرے دل کو کبھی احساسِ مسرت نہ ہوا

دل شگفتہ نہ ہوا جوشِ مسرت سے کبھی
کاہشِ غم نہ مٹی، میری طبیعت سے کبھی

مسکراتی ہوئی آئی نہ خوشی کی تنویر
نور چمکا نہ مرے گوشۂ خلوت سے کبھی

مجھے دونوں نے سبکسارِ تمنا نہ کیا
بھیک مانگی کبھی وحشت سے محبت سے کبھی

سوز ہی سوز میں گزری مری عمرِ فانی
ساز نے لاگ نہ کھائی مری فطرت سے کبھی

تشنۂ کیف وہ ہوں میکدۂ ہستی میں
کہ نہ مخمور ہوا بادۂ عشرت سے کبھی

جب سرِ میکدہ تقسیم خوشی ہوتی تھی
کیا خبر ہے، مری تقدیر کہاں سوتی تھی؟

یوں جھلکتی ہے خوشی خاطرِ ویراں میں کبھی
جیسے اک شمع جلے گورِ غریباں میں کبھی

چبھتی رہتی ہے کوئی چیز بطورِ نشتر
جگر و دل میں کبھی اور رگِ جاں میں کبھی

زندگی کی یونہی ہوتی رہیں راتیں کالی
خوابِ حرماں میں کبھی خوابِ پریشاں میں کبھی

بن گئی فطرتِ افسردہ حجابِ ہر رنگ
دل شگفتہ نہ ہوا صحنِ گلستاں میں کبھی

یہی عالم ہے تو کیا یاد کریں گے ہم بھی
آئے تھے سیر کو غمخانۂ دوراں میں کبھی

ذوقِ مستی نہ مذاقِ مے و مینا نہ ملا
فطرتِ شمع ملی مشربِ پروانہ ملا

فطرتاً شعلۂ جولانِ محبت ہوں میں
اس لئے دہر میں محرومِ مسرت ہوں میں

عشق کی آگ ازل سے ہے فروزاں دل میں
ایک آتش کدۂ سوختہ فطرت ہوں میں

حسن اگر چاہے تو آساں ہے مری چارہ گری
گو ہوں بیمار، مگر قابلِ صحت ہوں میں

میرے ساقی کو یہ پیغام کوئی دے میرا
تشنۂ یک نظرِ مہر و مروت ہوں میں

تو اگر چاہے تو ممکن ہے حفاظت، ورنہ
صورتِ شمعِ سحر مائلِ رخصت ہوں میں

بجھ گیا میں تو ہے رسوائی فطرت تیری
عالمِ روح میں گونجے گی شکایت تیری

جب یہ سنتا ہوں کہ تنہائی ہی ملجائے سکوں
دشت وکہسار سے کرتا ہوں تمنائے سکوں

جب یہ سنتا ہوں کہ ہے حُسن خدائے تسکیں
قدمِ حُسن پہ جُھکتا ہوں بہ سودائے سکوں

جب یہ سنتا ہوں بصیرت میں ہیں انوارِ شکیب
چھپ کے ہر ذرّے میں کرتا ہوں تماشائے سکوں

جب یہ سنتا ہوں کہ فطرت کے مناظر میں ہے کیف
عالمِ رنگ میں پھرتا ہوں میں جویائے سکوں

آہ لیکن ہے وہی تیرگیٔ خلوتِ غم
نہ تجلّیِ مسرّت، نہ تجلائے سکوں

دعوتِ کیف، توقع سے فزوں دے مجھ کو
ہے کوئی آج کہ پیغامِ سکوں دے مجھ کو!

تاروں کا گیت

اے دنیا کے رہنے والو! تم کیوں مجبورِ پستی ہو
ہم بھی اُس کی آبادی ہیں تم جس دنیا کی بستی ہو
تم میں ہم میں کچھ فرق نہیں، مخلوق خدا کی دونوں ہیں
وابستہ ایک ہی رشتے سے یہ نوری خاکی دونوں ہیں
ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، ہم ہنستے ہیں تم روتے ہو
ہم جاگتے رہتے ہیں شب بھر، تم غافل ہوکر سوتے ہو
ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، ہم روحانی گہوارے ہیں
ملفوف تکدّر میں تم ہو، انوار کے ہم فوّارے ہیں
ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، تم اپنی حقیقت بھول گئے
ہم اپنی حقیقت کو سمجھے، باطل کی لعنت بھول گئے
ہاں فرق اگر ہے تو اتنا ہم بے خود ہیں خود دار ہو تم
ہم مست جمالِ عرفاں سے اور بدمستِ پندار ہو تم

ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، تم غافل ہو بیدار ہیں ہم
اُس نشّے سے محروم ہو تم جس نشّے سے سرشار ہیں ہم
جو نورِ حقیقت ہم میں ہے وہ تم میں بھی تابندہ ہے
لیکن ہے تمہارا دل مردہ اور روح ہماری زندہ ہے

جب رات کا سناٹا سطحِ عالم پر طاری ہوتا ہے
تو بیعِ غفلت کا فرمانِ مُہلک جاری ہوتا ہے
تاریک شعاعیں شعلوں سے دوزخ کے نکالی جاتی ہیں
اس تاریکی سے غفلت کی زنجیریں ڈھالی جاتی ہیں
پھیلایا جاتا ہے اُن کو پھر ہستی کے میدانوں پر
پھینکا جاتا ہے دُنیا کے عشرت اندوز ایوانوں پر
انسان شعاعِ نور سمجھ کر خود اِن میں کھو جاتا ہے
نادان مقید غفلت کی زنجیروں میں ہو جاتا ہے
عشرت جس کو یہ سمجھا ہے وہ موت ہے غافل انساں کی
تن آسانی کی ظلمت میں لُٹتی ہے محفل انساں کی

تم رات کو اے دنیا والو فکرِ راحت میں مرتے ہو
یوں ضائع آدھی عمر اپنی اک خوابِ گراں میں کرتے ہو
ہم اپنے روشن گیتوں سے جب رات جگانے آتے ہیں
آغوشِ اجل میں خوابیدہ ساری دنیا کو پاتے ہیں
تم سُن نہیں سکتے وہ نغمے جن سے غفلت شرماتی ہے
جب اُن کی آگ برستی ہے ساری ہستی تھرّاتی ہے
ہم روح کی مستی سے بھر کر پیمانے اپنے لاتے ہیں
پیغام سکونِ ہستی کا دنیا کو دینے آتے ہیں

اے غافل انساں جاگ کبھی، ہم سے فیض روحانی لے
جانِ محزوں کی تسکیں لے غمگین دل کی تابانی لے
اے غافل انساں لوٹ کبھی، بے مانگے دولت لٹتی ہے
تو وقت گنواتا ہے سوکر اور شب بھر نعمت لٹتی ہے
اے غافل انساں دیکھ کبھی پچھلے کو کیا کچھ ہوتا ہے
فطرت ملنے کو آتی ہے، اور تو بے پروا سوتا ہے

اے غافل انساں سوچ کبھی، یہ راز نہیں، آئینا ہے
وہ موت کو خود کیوں دعوت دے، جس کو دنیا میں جینا ہے

یہ گیت ہے، وحیِ عرشِ خدا، الہام کی صوتِ راز ہے یہ
جس ساز کا تو اک پردہ ہے اُس کی رنگیں آواز ہے یہ

بچمن در آ

دیکھ وقت صبح گلہائے شگفتہ کی شفق — آئینہ ہے بزمِ فطرت کا ہر اک رنگیں ورق
دیکھ کلیوں کی صبوحی میں شرابِ لالہ فام — صبح کے رنگوں سے اُسکے ڈھالنے کا اہتمام
دیکھ پھولوں کی رگوں میں زندگی چڑھتی ہوئی — قوتِ بالیدگی سے تازگی بڑھتی ہوئی
دیکھ اس رنگینی و نزہت سے رس بہتا ہوا — نورِ فطرت آشیاں سے تا قفس بہتا ہوا
دیکھ اس صد رنگ خاموشی میں جوشِ گفتگو — نغمۂ شبنم سے پیدا گرمیٔ آوازِ ہُو
دیکھ شاخوں میں خمِ محرابِ طاعت کی ادا — جھوم کر ہر بار جھکنے میں محبت کی ادا
دیکھ بزمِ رنگ و بو کو غور کی نظروں سے دیکھ! — کیا عیاں ہوتا ہوا ان مہکے ہوئے جلووں سے دیکھ!

اکتسابِ کیف کر کے اس تکیف زار سے
سرخوشی دل کی بڑھالے بادۂ اسرار سے

شاعر اور سروش

یہ پچھلی رات، یہ تاریک عالمِ خاموش
فلک سے تا بہ زمیں یہ تجلیات کا جوش!

حریمِ قلب سے اک راہ عرش تک پیدا
بھری ہوئی ہے سکوں سے خیال کی آغوش

یہ چاند اور یہ تارے، نشانِ منزلِ دوست
یہ کیف اور یہ تسکین، خضرِ منزل کوش

پلائی ساقیِ شب نے تند و تیز ایسی
نشاطِ خواب سے سارا جہاں ہوا مدہوش

اب اس کا بار ہے تکلیفِ دوشِ سجّادہ
"امامِ شہر کہ سجّادہ می کشید بدوش"

ہے کائنات میں بیدار، صرف اک شاعر
"کہ ہست گوشِ دلش محرمِ پیامِ سروش"

بصد نیاز درِ دل پہ ہے نظر مسجود
"ہزار گونہ سخن بردہان و لب خاموش"

حریمِ عرش پہ ارمانِ جبہ سائی ہے
بلند فکر کا پیمانہ گدائی ہے

ہوئی ہے بارشِ الہام قلب پر اس کے
ہے اس کا دیکھنا سننا بغیرِ دیدہ و گوش

براہِ راست مخاطب ہے اس سے ہاتفِ غیب
"مکن بہ عشق مباہات و زہد ہم مفروش"

صدائیں کان میں یہ آرہی ہیں صاف اس کے — "چو قربِ او طلبی در صفائے نیّت کوش"
صفائے قلب سے یہ ہے تہیّہ ساعر — "بروئے یار بنوشیم و بانگِ نوشا نوش"
"ببانگِ چنگ بگوئیم آں حکایتہا" — "کہ از نہفتنِ او دیگِ سینہ میزد جوش"
وہ راز کھولدوں، جو مجھ پہ فاش ہیں اس وقت — خموش تا بہ کجا، چھیڑ دوں فسانۂ دوش
اسی خیال میں ہوتے ہیں صبح کے آثار — محیطِ دہر سے اُٹھتا ہے ایک سیلِ خروش

وہ جبر کر کے سکوت اختیار کرتا ہے
سکونِ وقت کا پھر انتظار کرتا ہے

نوروز

عشرت کا فریب عشرت آموز ہے آج — ورنہ کل تک جو تھا، وہی سوز ہے آج
جس دن کوئی کام تجھ سے ہو جائے نیا — اُس روز یقین کر کہ نوروز ہے آج

خورشیدِ خیالِ عالم افروزِ من است — تابانیٔ فطرت ہمہ از سوزِ من است
ہر نالۂ موزوں پئے روحِ است نشاط — نازم بنوائے نو، کہ نوروزِ من است

خُدا کی آواز

نفسِ گرم سے جنّت کی ہوا آتی ہے
دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

چھیڑ دیتا ہے مرا سازِ رگِ جاں کوئی
نظر آتا ہے مرے دل میں غزل خواں کوئی

کتنے میخانے چھلک پڑتے ہیں پیمانے سے
لہلہاتے ہیں چمن پھول کے کاشانے سے

شورِ ہنگامۂ کونین کا ہوتا ہے خموش
خلوتِ راز سے آتی ہے ہوا نغمہ فروش

اپنی ہستی کو سمجھتا ہوں میں اک عالمِ ہوش
پرِ جبریلؑ کی کانوں میں صدا آتی ہے

دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

"اے مرے دفترِ تقدیر کے اک نقطۂ خاص
جسم انوار و ضیا، پیکرِ مہر و اخلاص

میں نے اسرارِ حقیقت کا پتہ تجھ کو دیا
سوزِ دل تجھ کو دیا سازِ نوا تجھ کو دیا

ڈالدی اک نئی دُنیا کی بنا تیرے لئے
مہر و مہ تیرے لئے ارض و سما تیرے لئے

چاند کی شمع سے روشن کیا راتوں کو تری
رس دیا نکہتِ الہام سے باتوں کو تری

کھولدی عرش کی اک راہ ترے دل کے قریب
دور کرنے پہ بھی رکھا تجھے محفل کے قریب

ہم ترے دل میں ہیں انوارِ سویدا کی طرح — تجھے گھیرے ہوئے ہم ہیں تری دنیا کی طرح

یہ ہمارے ہی کسی جلوۂ پیدا کی طرح — پیرہن سے ترے خوشبوئے وفا آتی ہے"

دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

"پھر بھی تو بزمِ حقیقت میں ہے کوتاہ نظر — ہے ترا قول کہ "العِلمُ حجابُ الاکبر"

ہم نے فطرت کا جو قانون کیا تھا تصنیف — کیا سمجھتی اُسے ذہنیتِ انسانِ ضعیف

نور کو نار اندھیرے کو اُجالا سمجھا — نقشِ بے رنگ کو سیمائے ثریا سمجھا

موت کو مٹنے مٹانے کا بہانہ جانا — اور ہنگامۂ ہستی کو فنا نہ جانا

نظرِ غور کی محتاج ہے تمہید تری — نقصِ ہستی یہ ہے ناقص ابھی تنقید تری

کون آگاہ ہے کیا وقتِ فنا ہوتا ہے — ذہنِ انساں کا اندھیرے میں رسا ہوتا ہے

جسم پر دیکھ کے آثارِ مکلّف لرزاں — وہ سمجھتا ہے کہ انسان کو مرنا ہے گراں

بسترِ مرگ پہ آ، درسِ فنا دیں تجھ کو — موت ہی عینِ بقا ہے یہ بتا دیں تجھ کو

آ یہ اسرار بھی فطرت کے سکھا دیں تجھ کو — ہم خود آتے ہیں کہ لینے کو قضا آتی ہے"

دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

"تُو نہ گھبرا یہ فنا اور بقا کچھ بھی نہیں — ایک فریب ایک تسلی کے سوا کچھ بھی نہیں

موت ہیں تیری کتابوں میں قضا کے معنی
ظاہری تجھ کو سکھائے ہیں فنا کے معنی

روح زندانِ تعیّن سے جو گھبراتی ہے
لوٹ کر مرکزِ اصلی پہ چلی آتی ہے

جب رہا قیدِ قفس سے کوئی ہوتا ہے اسیر
کیا رہائی کو وہ کرتا ہے فنا سے تعبیر؟

موت تکلیف نہیں، عازمِ رحلت کیلئے
ایک قانون ہے افراد کی عبرت کیلئے

کیا تجھے یاد ہے ہنگامِ ولادت اپنا؟
کیا تجھے یاد ہے دیباچۂ خلقت اپنا؟

گر یہ وقت ولادت کی خبر ہے تجھ کو؟
یاد اُس عہد کی شام اور سحر ہے تجھ کو؟

کیفِ تخلیق سے سرشار بنا کر ہم نے
مہدِ تخلیق میں ڈالا تجھے لا کر ہم نے

جب نہیں اپنے فسانے کا بھی عنوان معلوم
پھر ہو کیا تکملۂ ہستئ انساں معلوم!

مرض الموت کا تجھ کو نہیں درماں معلوم
ہمیں اس دردِ مصیبت کی دوا آتی ہے"

دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

"ہے ترا علم بھی ناقص ترا عرفاں بھی غلط
درک تیرا، تری تخئیلِ پریشاں بھی غلط

فہمِ فطرت کے لئے چاہیے امعانِ نظر
ابھی گہرائی میں فطرت کی نہیں تیرا گزر

دن کو اک صفحۂ سادہ ہے بیاضِ خلقت
رات کے پردے میں کھلتی ہو کتابِ فطرت

کہکشاں صرف ہو اک سطرِ کتابِ الہام
اور چھوٹا سا ہے اک دائرہ یہ ماہِ تمام

آسمانوں پہ اشارات کی بچھتی ہے بساط / یہ ستارے نہیں ہیں سرمدی لفظوں کے نقاط
اتنے لفظوں میں عبارات ہیں کتنی مضمر؟ / ان کی کثرت سے کچھ الفاظ کا اندازہ کر
رات کے وقت ہو جب محفلِ عالم خاموش / کر ذرا غور سے نظارۂ ایوانِ سروش

بھیدِ ہستی کا فروزاں نظر آئے گا تجھے / ہر ستارہ ادبستان نظر آئے گا تجھے
راز اس ساز میں عریاں نظر آئے گا تجھے / گونجنے اس میں ہماری ہی نوا آتی ہے"

دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

داغ

بلبلِ شیریں نوا خود بن کے ملہم آگیا / رازِ حسن و عاشقی اک بات میں سمجھا گیا
وصل کی تفسیر یوں لکھی کہ سرخوش کر دیا / ہجر کی تصویر وہ کھینچی کہ دل گھبرا گیا
جس کا ہر نغمہ نشاطِ روح کا پیغام تھا / وہ نوا سنجِ چمن، سارے چمن پر چھا گیا
تشنگیِ جام و بادہ اب ہے میخانے میں عام / تھا وہ ساقی اور ہی جو میکدے برسا گیا
خاکِ دہلی ہوں ترے اسلاف پر لاکھوں سلام / تیرا اک ذرہ ہزاروں بجلیاں چمکا گیا
روح اس کی آج تک صرفِ بہارِ باغ ہے / سینۂ ماہ و گل و لالہ میں اس کا داغ ہے

تیرے ماضی کی یاد

مری نظر میں ہے دیباچۂ شباب ترا
کہ مست حسن کے نغموں سے تھا رباب ترا

وہ تیرا عالمِ طفلی وہ ترا عہدِ جمیل
سرود و شعر سے وہ ذوق بے حساب ترا

وہ اپنے کیف میں خود اک طرح کی مدہوشی
وہ اک مجسمۂ آلودۂ شراب ترا

مری خوشی پہ وہ تیرا تبسمِ رنگیں
وہ میرے جذبۂ برہم پہ اضطراب ترا

وہ شوق کے لبِ تشنہ، وہ تیرا عارضِ تر
وہ مشتِ خاک کے قبضے میں آفتاب ترا

وہ آبشارِ رواں مے کے تیرے ہونٹوں سے
وہ بوئے بادہ میں ڈوبا ہوا گلاب ترا

وہ ابتدائے محبت وہ چاندنی راتیں!
مرے کنار میں وہ پُرسکون خواب ترا

وہ وقتِ خواب سنبھلتا ہوا ترا آنا
وہ فرشِ گل پہ مچلتا ہوا شباب ترا

وہ کروٹوں میں مسکتا ہوا لباسِ لطیف
وہ مستیوں سے چھلکتا ہوا حجاب ترا

کبھی وہ نرمئ گفتار پر ترا ہنسنا
کبھی وہ گرمئ آغوش پر عتاب ترا

وہ شب کے سایے میں کافر ملاحتیں تیری
سحر کے بھیس میں وہ حسنِ لاجواب ترا

وہ التفات، وہ رجحان وقتِ عرضِ سخن — وہ انکھڑیوں کو جھکانا دمِ خطاب ترا
وہ آرزو سے کھٹکتا ہوا سوال مرا — وہ رنگ و بو سے مہکتا ہوا جواب ترا
وہ تیرے کیفِ ترنم میں میرا کھو جانا — وہ میرے گرمِ تنفس سے پیچ و تاب ترا
وہ میرے ذوقِ وفا میں فنائیت تیری — وہ ماسوا سے بہر حال اجتناب ترا
وہ تیری نظروں میں میری نظر پیامِ حیات — وہ میری آنکھ میں ہر جلوہ کامیاب ترا

کہاں گیا وہ ترا دورِ سادگی ظالم — جب احتیاط سے بیزار تھا حجاب ترا
کہاں گیا وہ زمانہ، وہ اک جہانِ نشاط — چھری لئے ہوئے کیوں آگیا شباب ترا

سلامِ شوق تری اُس حیاتِ رفتہ کو
پیامِ مرگِ محبت ہے انقلاب ترا

نیا عہد نامہ

ہے آج میکدۂ عشق کا نظام نیا
نئی شراب ہے۔ ساقی نیا ہے۔ جام نیا

نیا مغنیۂ نو کے ہاتھ میں ہے رباب
نیا کلیم، تکلم نیا، کلام نیا

جمود بستہ تخیل کو فرصتِ پرواز
ہوا نئی ہے، فضائیں نئی ہیں، بام نیا

شکستہ ہے قدحِ بزمِ غزنوی و ایاز
ہے عشق و حسن کی محفل میں اہتمام نیا

نظر نواز نئے اب ہیں عارض و گیسو
نیا ہے صبح کا جلوہ۔ جمالِ شام نیا

سمن طراز ہے فطرت بجائے لالہ و گل
روش تمام نئی ہے، چمن تمام نیا

سوادِ کہنۂ گلشن ہے مائلِ تجدید
نئی بہار، نیا رنگ و بو مشام نیا

ضیائے تازہ ز بامِ افق شب افروز است
نوید دورِ صبوحی، کہ صبحِ نوروز است

عطا ہوا نئے ہاتھوں کو انصرامِ وفا
نئے قلم سے لکھا جا رہا ہے نامِ وفا

نمودِ مشرقِ نو ہے جہانِ الفت میں
کہ دے رہی ہے کرن صبح کی پیامِ وفا

یہ کعبہ اور کسی کو نہ اب ملے یارب
حریمِ حسن میں ہو مستقل قیامِ وفا

حدیثِ عشق ہے اور گوشِ التفاتِ جمال
اسی حدیث پہ ہو جائے اختتامِ وفا

نشاطِ روح کو اندیشۂ فنا نہ رہے — نصیب ذوقِ تمنا کو ہو دوامِ وفا
وفا و حسن کا رنگین وہ اُٹھے سیلاب — کہ پھر اُبھر نہ سکے شوقِ تشنہ کامِ وفا
دعائے حسن، مسرت فزائے خاطرِ عشق — قبولِ فطرتِ ناز آفریں سلامِ وفا

چمن بہار سے جب تک شگوفہ بار رہے
یہ دو دلوں کا نیا عہد استوار رہے

رنگین تیتری (عورت)

راتیں بسانے والی، دن جگمگانے والی — تکلیف سہنے والی اور مسکرانے والی
مخصوص ایک گل پر قربان ہونے والی — اپنے ہی رنگ و بو سے حیران ہونے والی
عصمت کے گلکدے میں پابندِ دستِ محرم — اُڑنے لگے تو نکہت، گرنے لگے تو شبنم
دامانِ گل سے مستی بن کر اُلجھنے والی — اوراقِ گل کو اپنی دنیا سمجھنے والی
نازک سی موجِ رقصاں، رنگیں سی ایک بجلی — مہکا ہوا سا شعلہ، دہکی ہوئی سی مستی
لرزاں سا اک ستارہ، رخشاں سا ایک جگنو — پربستہ ایک کویل، مجبورِ رم اک آہو
جذبات کی فضا میں اک ذرّہ پریدہ — رنگوں کے ارتقا میں اک نقشِ برگزیدہ
کاہیدہ سا ترنم خوابیدہ سا ترانہ — پُرجوش کیفِ بادہ، خاموش اک فسانہ

صد رنگ پھول جس میں مردوں کی زندگی ہے
"عورت" اُسی چمن کی رنگین تیتری ہے

ہندوستانی ماں کا پیغام

اے مرے فرزند اے پروردۂ خاکِ وطن
اے امینِ افتخارِ جذبۂ پاکِ وطن

کون تھی میں اور اب کیا ہوں بتاتی ہوں تجھے
آج اپنا قصۂ ماضی سناتی ہوں تجھے

گھٹ گیا دم، دردِ دل کی پردہ پوشی تابکے؟
وقتِ اظہارِ حقیقت ہے خموشی تابکے؟

پہلے میں بچوں کو دیتی تھی پیامِ درسِ جنگ
بھر دیا کرتی تھی دل میں سرفروشی کی امنگ

میں بھی خود تیر افگنی، صید افگنی میں فرد تھی
گھر میں عورت تھی، سیاست کی فضا میں مرد تھی

مشورے مجھ سے لئے جاتے تھے امن و جنگ کے
تھے بیاضِ ذہن میں خاکے ہزاروں رنگ کے

پاک دل سے پہلے سب کرتے تھے غمخواری مری
"مادرِ مشرق" سمجھ کر تھی پرستاری مری

میرے بچے صف شکن تھے اور تیر انداز بھی
منچلے بھی، صاحبِ ہمت بھی، سرافراز بھی

تھا حکومت میں مرا حصہ، سیاست میں بھی تھا
دخل میرا اہتمامِ ملک و ملت میں بھی تھا

یاد ہے دشت و جبل کو ہمتِ سیر و شکار
گرد سے آگے اڑا کرتا تھا میرا راہوار

میں الٹ دیتی تھی دشمن کی صفیں تلوار سے
دل دہل جاتے تھے شیروں کے مری للکار سے

جرأت ایسی کھیلتی تھی دشنۂ و خنجر کے ساتھ
باوفا ایسی کہ ہوتی تھی فنا شوہر کے ساتھ

رفتہ رفتہ "احتیاط و مصلحت" کا غل ہوا — خود غرض انساں اسیرِ حلقۂ کاکل ہوا
سب سے پہلے میری آزادی یہاں چھینی گئی — ذہن کچلا، دل کیا غارت زباں چھینی گئی
چھٹ گیا ہاتھوں سے میرے دامنِ علم و عمل — کر دیا محلوں میں لاکر قید مجھ کو بے محل
مسلکِ اہلِ ہوس میں "میں" حسیں سمجھی گئی — بزمِ ہستی کی "متاعِ بہتریں" سمجھی گئی
کوئی کہتا تھا فرشتہ، حور کہتا تھا کوئی — شکلِ انساں میں خدا کا نور کہتا تھا کوئی
چھین کر تلوار پہنا دیں سنہری چوڑیاں — رکھ دیا ہر جوڑ پر زیور کا اک بارِ گراں
پہلے جن آنکھوں کا "تنقیحِ حقیقت" کام تھا — اب زبانِ عشق میں "بیمار" اُن کا نام تھا
پہلے جو زلفیں، رسن تھیں ظلم رانوں کے لئے — اب فقط کالی گھٹا تھیں عیش خانوں کیلئے
پہلے جس قامت پہ پھبتا تھا لباسِ خسروی — ریشمی پیراہنوں سے اُس کی آرائش ہوئی
پہلے جو تیور تھے بجلی، اب حیا آسودہ تھے — جن سے کف اُڑتا تھا، اب وہ لبِ مسی آلودہ تھے
ہوتے ہوتے یوں ہوئی تحلیلِ جسمانی مری — بن گئی عینِ نزاکت خستہ سامانی مری
اک نئے دوزخ کی تیاری ہوئی میرے لئے — "گھر کی جنت" چار دیواری ہوئی میرے لئے
نصف قیمت گھروں میں بند جب کر دی گئی — ملک کی کمزوریوں کو مل گئی قوت نئی

مرد تھے مخصوص، اقتدارِ دوامی کے لئے
اور میں تھی وقفِ تخلیقِ غلامی کے لئے

درس آزادی کا دیتی کیا تجھے آغوش میں
میں تو خود ہی قید تھی اک مجلسِ گُل پوش میں

میں نے دانستہ بنایا خائف و بزدل تجھے
میں نے دی کم ہمتی کی دعوتِ باطل تجھے

دل کو پانی کرنے والی لوریاں دیتی تھی میں
جب گرج ہوتی تھی دامن میں چھپا لیتی تھی میں

توپ اور تلوار کا لیتی نہ تھی میں نام تک
صبح سے پیشِ نظر رکھتی تھی تجھ کو شام تک

ہاں تری اس پست ذہنیت کی میں ہوں ذمہ دار
تُو تو میری گود ہی میں تھا غلامی کا شکار

اب میں سُنتی ہوں کہ نظمِ بزم ہے بدلا ہوا
اہلِ محفل کا خیال و عزم ہے بدلا ہوا

اب میں سُنتی ہوں کہ عورت کو ملے ہیں کچھ حقوق
عرصۂ علم و عمل میں اس کو حاصل ہے وثوق

اب میں سُنتی ہوں اُسے آزادیٔ تقریر ہے
اب میں سُنتی ہوں کہ گویا پیکرِ تصویر ہے

اس لئے بیخوف اک پیغام دیتی ہوں تجھے
لے دوائے گردشِ ایام دیتی ہوں تجھے

گو مقید اب بھی میرا پیکرِ ناشاد ہے
روح تو ابرِ ہمالہ کی طرح آزاد ہے

سُن کہ اس دُنیا میں ملتا ہے اُسی کو اقتدار
جس کو اپنی قوتِ تعمیر پر ہو اختیار

زندگی کے جو بلند و پست سے آگاہ ہو — محفل عالم کے بند و بست سے آگاہ ہو
ظلمتوں میں لپکے جو نکلے صداقت کا چراغ — فلسفے سے ارتقا کے جس کا روشن ہو دماغ
جس کو ہو معلوم مقصد ہستیٔ مخلوق کا — جس کو ہو احساسِ کامل پستیٔ مخلوق کا
جس کے دل میں درد ہو اہلِ وطن کا موجزن — ہو رگوں میں جس کی پنہاں سوزِ ناموسِ وطن
جو غلامی کو سمجھ لے لعنتِ انسانیت — جس کا نصب العین ہو حرّیتِ انسانیت
اپنی عزت جو یقیں کرتا ہو عزّت ملک کی — جان دے کر بھی جو کر سکتا ہو خدمت ملک کی
جس کی نظروں میں ہو باغِ خلد صحرائے وطن — بھوک میں اور پیاس میں بھی جسکو یاد آئے وطن
ذہن جس کا جذبۂ اصلاح سے معمور ہو — منزلِ تخریب شورش سے جو کوسوں دور ہو

جو حقیقت سے ہر اک باطل کا رشتہ جوڑ دے
نخوت و پندار کے جھوٹے بتوں کو توڑ دے

محفلِ انسانیت میں کچھ نہیں اُس کا وقار — جو نگاہِ ملک و قومیت میں ہو بے اعتبار
جس کا مقصد پیٹ بھرنے کے سوا کچھ بھی نہ ہو — کام جس کا کچھ نہ کرنے کے سوا کچھ بھی نہ ہو
خود غرض، خود کام، بد اندیش ہو، بدنام ہو — شورشِ عالم میں جو نا واقفِ انجام ہو
جادۂ حرص و ہوا میں ٹھوکریں کھاتا پھرے — چیل کوّوں کی طرح دن رات منڈلاتا پھرے
جس کو جہل و کبر کے اوہام سے فرصت نہ ہو — خوابِ صبح و سرخوشیٔ شام سے فرصت نہ ہو

جس کا مشربِ مکر و فن ہو جس کا مشرب ہو فریب
جو ذرا سی پھانس سے ہو جائے مطلق ناشکیب

جو منافق ہو ریاکار اور دنیا ساز ہو
جو فضا کی پستیوں میں مائلِ پرواز ہو

قوم سے اور ملک سے غداریاں کرتا رہے
شورشِ بے کار کی تیاریاں کرتا رہے

بے محل نغموں کو جس کے سب کہیں ننگِ وطن
مضمحل ہاتھوں میں جس کے سرد ہو جنگِ وطن

جو غلامی کے لباسِ تنگ میں اکڑا پھرے
نام کا آزاد ہو، زنجیر میں جکڑا پھرے

زر پرستی کے لئے بن جائے جو ملت فروش
بے حمیت ہو، وفا دشمن ہو، اور غیرت فروش

اُس سے بڑھ کر اور قسمت کا کوئی ہیٹا نہیں

وہ تو "ابن الوقت" ہے حاشا مرا بیٹا نہیں!

شاعر کا مذہب

مجھے کانٹوں سے ہے دلبستگی پھولوں سے الفت ہے
عقیدت میں مری کل کائنات اک بزمِ فطرت ہے

نہیں محدود رسم و راہ تک ذہنِ رسا میرا
ہو کر داغ آلود کیوں ان لغزشوں سے آئینا میرا

کلیسا میں بھی مجھ کو موقعِ تکمیلِ مستی ہے
مجھے محرابِ کعبہ میں بھی اذنِ بت پرستی ہے

مجھے اس بزمِ فطرت میں ہی آزادی نظارہ کی
پھرا کرتا ہوں سرخوش انجمن میں چاند تارہ کی

سمجھتا ہوں کہ ہر انساں کے دل کا آئینا میں ہوں
نہیں نفرت کسی سے وہ نگاہِ آشنا میں ہوں

خیالوں میں مرے وسعت نہیں محدود بے حد ہے
یہ ساری بزمِ عالم وقتِ سجدہ میرا معبد ہے

قیودِ سبحہ و زنار سے بھی ماورا ہوں میں
تعین کی حدیں ٹھکرا کے آگے بڑھ گیا ہوں میں

مجھے مطلب نہیں دیر و حرم کی تنگ راہی سے
براہِ راست ہے رشتہ مرا عرشِ الٰہی سے

خدا کا نام لے کر توڑتی ہیں میری تکبیریں
یہ کس نے ڈال دی ہیں پاؤں میں انساں کے زنجیریں؟

کہ وا اعلان ہے فطرت ہی مذہب نوعِ انساں کا
مری ملت میں جھگڑا ہی نہیں ہے کفر و ایماں کا

پھر اس اعلان میں گنجائشِ چون و چرا کب ہے
کہ جو فطرت کا مذہب ہے وہی شاعر کا مذہب ہے

اے کہ تو گلزارِ فطرت کا شگفتہ پھول ہے
اے کہ مستقبل ترا اک مایۂ مقبول ہے

اے کہ تیری آنکھ میں ہے ارتقا کی روشنی
اے کہ پنہاں ہے ترے دل میں وفا کی روشنی

پیکرِ پُرنور تیرا صد گُل و صد رنگ ہے
انقلابِ ہستیٔ عالم ترا آہنگ ہے

تیری نازک زندگی کانٹوں میں تھی الجھی ہوئی
باوجود اس کے بھی فطرت ہی تری سلجھی ہوئی

بارہا دھوکے دیئے امیدِ باطل نے تجھے
راستے سے بارہا بھٹکا دیا دل نے تجھے

ناگہاں فطرت نے تجھ کو اک صدائے ہوش دی
عشق کی پہلی نظر نے دعوتِ آغوش دی

حق محبت کے ترے آگے ادا ہونے لگے
یعنی تیرے پاؤں پر سجدے روا ہونے لگے

ہر ادا حسن و وفا کا کیف برسانے لگی
عشق کی خلوت میں جنت کی ہوا آنے لگی

اوّل اوّل کچھ گلے، کچھ شکوہ خوانی بھی رہی
بے نیازی بھی رہی، نالہ فشانی بھی رہی

آخر آخر ختم یہ سب داستانیں ہو گئیں
ترجماں اک دل کی گویا دو زبانیں ہو گئیں

عارضی اک دورِ فرقت ناگہاں حائل ہوا
امتحاں پر جذبۂ حسن و وفا مائل ہوا

عشق بیچارہ مسافر بن کے جا پہونچا وہاں
کوئی پیغامِ وفا لے کر نہ پہونچا تھا جہاں

داستانِ درد سن کر رحم کچھ آیا تجھے
دامنِ مژگاں سے آنسو تو نے پونچھے عشق کے

آہ، وہ باتیں تری تسکین بخش و دلفریب
وہ تری قسمیں، وہ دلجوئی، وہ تدبیرِ شکیب

وہ چھلکنا آنسوؤں کا تیری چشمِ ناز میں
وہ تراراے عزم و ہمت کے تری آواز میں

رفتہ رفتہ یہ ہوا ثابت، وہ سب اک خواب تھا
جوشِ ہنگامی ترا، جاتا ہوا سیلاب تھا

ہو گیا ثابت تری فطرت ہے آسانی پسند
وقت پر ہو جائے جو کچھ تو ہے اس پر کاربند

تیرے دل میں ہمت و احساس مطلق بھی نہیں
تجھ کو پیمانِ وفا کا پاس مطلق بھی نہیں

بوالہوس میں بھی نظر آتی ہے تجھ کو شانِ عشق
شورشِ حرص و غرض بھی ہو تجھے اعلانِ عشق

ٹین کے ٹکڑے کو بھی تو جانتا ہے آفتاب
کاغذی پھولوں سے آتی ہے تجھے بوئے گلاب

سوچ کس کے دل میں ہے تیرا حقیقی اضطراب؟
غور کر، تیرے لئے ہو زندگی کس کی خراب؟

ایک ہی اس بزم میں تیرا پجاری ایک ہے
اور سب جھوٹے ہیں وقفِ جاں نثاری ایک ہے

خلوتِ تخئیل میں اُس کی ہے تو چھایا ہوا
ہے وہ تیرے حسن کی گرمی سے گرمایا ہوا

اُس کے دل کی بیقراری گرمیٔ محفل سے پوچھ
بیٹھ کر یکسو تو اُس کا حال اپنے دل سے پوچھ

دے اُسے دعوت، بلا اپنے تصوّر میں اُسے
دیکھ دل کی آنکھ سے بزمِ تخیّر میں اُسے

اُس سے باتیں کر کے اُس کا حالِ دل دریافت کر
اس قدر کیوں ہو طبیعت مضمحل؟ دریافت کر

اُس کو دے تسکین اپنی نزہتِ گفتار سے — شوق کی باتیں کر اُس کی خاطرِ بیمار سے
دیکھ پھر چشمِ تصور سے، جو اُس کا حال ہے — بے نیازی سے تری وہ کس قدر پامال ہے
وہ تری بزمِ تخیل میں سکوں بر سائے گا — دل ترا اُس کے تصور سے تسلی پائے گا

جانتا ہوں میں تری فطرت بہت معصوم ہے — تو ابھی اک نقشِ سادہ ہے، مجھے معلوم ہے
جیسے تو اپنی حقیقت سے ابھی واقف نہیں — رُوح بھی تیری محبت سے ابھی واقف نہیں
اے تغافل کے پجاری، اے طبیعت کے غلام! — اک پریشانِ وفا کا آخری سُن لے پیام
بے نیازی حسن کی، جانِ وفا سہتی نہیں — عشق کی آغوش خالی فطرتاً رہتی نہیں
اب بھی ہیں گنجائشیں تیری کنارِ عشق میں — رنگ تیرا ہی فروزاں ہے بہارِ عشق میں
آنسوؤں میں عشق کے اب بھی ہے ہمدردی تری — عشق کے چہرے پہ ہے چھائی ہوئی زردی تری
اب بھی تیرا نام لے کر عشق کرتا ہے فغاں — اب بھی روح و قلب میں ہے عشق کے تو نغمہ خواں
اب بھی قدموں پر ترے اُس کی جبیں مسجود ہے — اب بھی وہ بندہ ہے تیرا اور تُو معبود ہے
ہے ابھی باقی ترے عہدِ وفا کا اعتبار — ہو دماغِ خلق میں جیسے خدا کا اعتبار

حرص مندوں کے پراگندہ قفس کو چھوڑ دے
عشق کی آغوش میں آجا، ہوس کو چھوڑ دے

شاعر ہے جانِ فطرت　　اسرار دانِ فطرت　　روحِ روانِ فطرت
گوش و زبانِ فطرت
تخئیل کو بیاں کے سانچے میں ڈھالتا ہے
الفاظِ بے زباں سے معنی نکالتا ہے

شاعر ہے وہ پیمبر　　نازل ہوا ہے جس پر　　الہامِ حق کا دفتر
سارے جہاں کا رہبر
جب وہ پکارتا ہے گم گشتہ کارواں کو
دیتی ہے روح بوسے ہر جنبشِ زباں کو

شاعر ہے سازِ محفل　　سوز و گدازِ محفل　　آگاہِ رازِ محفل
مقصد نوازِ محفل
ہر ساز میں اُسی کی آواز گونجتی ہے
ہر نغمہ ہے اُسی کا، ہر نغمے میں وہی ہے

شاعر ہے جوشِ ہستی　　مستی فروشِ ہستی　　خلّاقِ ہوشِ ہستی

تعمیرِ کوشِ ہستی

شاعر نہ ہو تو صوتِ ملہم فضول جائے

شاعر نہ ہو تو دنیا نظم اپنا بھول جائے

گناہِ عشق

خالقِ بحر و بر ہے عشق، مالک خیر و شر ہے عشق　　کہتے ہیں سب جسے خدا، کوئی نہیں مگر ہے عشق

عشق نہ ہو تو حسن کو کون دکھائے آئینہ　　حسن ہے جس پہ خود نثار حسن کی وہ نظر ہے عشق

عشق وہی تو برق ہے جس کی تڑپ ہر روح میں　　گرم ہے قلبِ کائنات جس سے وہی شرر ہے عشق

عشق کے دم قدم سے ہے شور و سکوں کا سلسلہ　　رونقِ انجمن ہے عشق، گرمیٔ رہگزر ہے عشق

ہے یہ متاعِ جاوداں، جنسِ وفا یہی تو ہے　　سود و زیاں سے بے نیاز دولتِ بےخطر ہے عشق

ہیں یہ دل و جگر فضول، عشق اگر نہ ہو نصیب　　دل کی حیات عشق ہے، زندگیٔ جگر ہے عشق

دے نہ فریبِ ترکِ عشق مجھ کو، کہ جانتا ہوں میں　　تیری نگاہ پست ہے اور بلند تر ہے عشق

مجرمِ ذوقِ عشق ہوں، حال مرا گواہ ہے

مجھ کو قبول یہ گناہ، عشق اگر گناہ ہے

عروجِ شب ہائے ماہ کا ہے، ضیا فضاؤں پہ چھا رہی ہے
عروسِ شب بے حجاب ہو کر، تجلّیوں میں نہا رہی ہے

چمک رہا ہے دُھلے ہوئے آسمان پر چاند چودھویں کا
برس کے بادل ابھی کُھلے ہیں، فضا کی خُنکی بتا رہی ہے

فلک بھی روشن، زمیں بھی روشن، مکاں بھی روشن، مکیں بھی روشن
جہان ہے اور روشنی ہے نظر جہاں تک بھی جا رہی ہے

سکوت دنیا پہ حکمراں ہے، نہ داستاں گو نہ داستاں ہے
عجیب منظر، عجب سماں ہے، نگاہ اِترائی جا رہی ہے

ہے ایک طوفانِ رنگ و نور اور اُس میں تیری ہوئی ہے دُنیا
بہار کی رنگ آفرینی نمو کی موجیں بڑھا رہی ہے

پہاڑ جنت بنے ہوئے ہیں، محیط ہے نور چوٹیوں پر
کرن جو ہے آبروئے چشمہ وہ آئینے سے بنا رہی ہے

ہے دَور میں چاند کا پیالہ اُفق پہ پھیلی ہوئی ہے مستی
رواں ہے یوں آبشار گویا شراب فطرت بہا رہی ہے
فضائیں رنگین اور سنہری، سکونِ مطلق ہے سب پہ طاری
یہ ہے طلسمِ نظر فریبی، کہ رات جادو جگا رہی ہے

تلاطمِ رنگ و بُو میں کیفِ نظر ہے اک پُر شباب جوگن
جو اپنے ماحول کی خموشی میں زندگی بن کے چھا رہی ہے
قریبِ چشمہ سجائے بیٹھی ہے مرگ چھالے پہ اپنی دُنیا
کوئی تو ہے چاند میں یہ جس سے نشیلی نظریں لڑا رہی ہے
نہ یادِ عقبیٰ، نہ ذکرِ دنیا، نہ فکرِ مستی، نہ ہوشِ ہستی
وہ محوِ آئینِ خود پرستی، فضا کے دل میں سما رہی ہے
اُدھر ہے اک آبشار غلطاں، اِدھر ہے زلفِ رسا پریشاں
وہ اپنی موجیں دکھا رہا ہے، یہ اپنی موجیں دکھا رہی ہے
حسین جوگن، جوان جوگن، جوان راتوں کی جان جوگن
خیال بن کر کسی کے رنگیں خیال میں کھوئی جا رہی ہے

یہ جاذبِ جزو کُل تصوّر! کہیں دو عالم اُلٹ نہ جائیں
یہ کیوں کشش آزما رہی ہے؟ یہ کیا قیامت اُٹھا رہی ہے!
یہ دن تو ہستی کے گلکدے میں بہار افروزیوں کے دن تھے
تو کیوں یہ سنسان جنگلوں میں شباب اپنا لُٹا رہی ہے
یہی ہے وہ عمر اور وہ موسم، بنا دے دیوانہ جس کو چاہے
نظر نظر اس کی دل نشیں ہے، ادا ادا مسکرا رہی ہے
مگر یہ فطرت کی ہے پجارن، تصوّر و محویت کی دیوی
نظر میں کوئی بسا ہوا ہے، کسی کو دل میں بسا رہی ہے
نہ آنکھ جھپکے، نہ ہونٹھ لرزیں، نہ ہاتھ اُٹھیں نہ پاؤں بہکیں
یہ اپنے آسن پہ بیٹھے بیٹھے قریب منزل کے جا رہی ہے
جمال سے اس کے پا رہا ہے فروغ ماہِ تمام کیا کیا
نگاہ خود موجِ بادہ بن کر فضا کی مستی بڑھا رہی ہے
یہ محو و مستِ خیالِ فطرت، شبابِ فطرت، جمالِ فطرت
جہاں کی فانی لطافتوں کو بقا کے آئیں سکھا رہی ہے
خیال طے کر رہا ہے تیزی سے جادۂ منزلِ حقیقت

وہ خود ہے مرکز پر اپنے قائم نہ آ رہی ہے نہ جا رہی ہے
پیام فطرت کا سن رہی ہے یہ گوشِ باطن سے محو ہو کر
اور اس کی یکسر زباں خموشی، پیامِ فطرت سنا رہی ہے
کہ جو حقیقت میں جذب ہو کر یہاں حقیقت پرست ہوگا
اُسی کی رنگیں تجلیوں سے دماغِ نظارہ مست ہوگا

عقل و عشق

ایکہ مے بازی بہ سازِ مغربی ... زیرکی و عشق، عشق و زیرکی
زیرکی در عشق عینِ گمرہیست ... بر حواسِ نو، اساسِ زندگیست
عشق چوں با زیرکی محکم شود ... کائناتِ عاشقی، برہم شود
عشق را با زیرکی آمیختن ... نیست جز خونِ حقیقت ریختن
تو و صد تعلیم عشق و زیرکی ... ما و نازِ عشق و سازِ بیخودی
کائناتِ ما صدائے سازِ ما ... سازِ ما ہمرازِ ما آوازِ ما
ما ز سازِ خویش سوزے یافتیم ... در جہانِ جانِ جاں برتافتیم
بیخودی ما را خدا آموز شد ... شامِ ما قبلِ سحر نوروز شد

تو وجود بینی، کہ خوئے ناکس است
ما خدا بینیم، مارا ایں بس است

صبحِ صادق

مجھے کیف بادۂ صبح میں، تجھے لطفِ خوابِ سحر میں ہے
وہ کہاں ہے تیرے خیال میں، جو بہار میری نظر میں ہے

کبھی میری بزمِ سحر میں آ تجھے میں دکھاؤں وہ آئینہ
جو تجلیوں سے گھرا ہوا، مری چشمِ جلوہ نگر میں ہے

ہوئی ختم محفلِ کہکشاں، ہے فسردہ رات کا کارواں
نہ ہیں وہ تاروں کی شوخیاں، نہ وہ موجِ نورِ قمر میں ہے

اثرِ سحر سے کھلا ہوا، ہے کنول کا پھول بنا ہوا
جو اک اشکِ گرم چھپا ہوا، کہیں چاکِ دامنِ تر میں ہے

یہی لمحہ صبحِ ظہور ہے، یہی لحظہ مشرقِ نور ہے
عجب انتظامِ سرور ہے، کبھی دل میں ہے کبھی سر میں ہے

تو برونِ خانہ برآ و بیں، کہ نگاہِ جلوہ نمائے من
سحرے عجیب نگاختہ بسوادِ بردہ سرائے من

ابھی راہ میں ہے عروسِ شب، ابھی گرم محفلِ ناز ہے
ابھی پَر پڑے ہیں جلے ہوئے، ابھی شمع صَرفِ گداز ہے
ابھی ہوش تشنۂ ہوش ہے، ابھی ہیں سکوت میں شورشیں
ابھی کائنات خموش ہے، ابھی بے صدا لبِ ساز ہے

ابھی عیش کامی و سرخوشی، ہے اسیرِ پردۂ بے خودی
ابھی محوِ خواب ہے غزنوی، ابھی سر دِ حُسنِ ایاز ہے
ابھی عرش پیشِ نگاہ ہے، ابھی رو برو ہیں حقیقتیں
ابھی روح مستِ نیاز ہے، ابھی دل پہ بارشِ راز ہے
جو ہے میری زندگیٔ نظر، وہ ہے میرے سامنے جلوہ گر
یہی وقتِ عشرتِ سجدہ ہے، یہی میرا وقتِ نماز ہے

توبیا و شغلِ صبوح کن، بشرابِ روح فزائے من
سحریست میکدہ در نفس زکمالِ صدق وصفائے من

صبوحی

صبح سے پہلے کیا بیدار قسمت نے مجھے
دعوتِ گلگشت دی کیفِ طبیعت نے مجھے

آنکھ کھلتے ہی صبوحی کا مجھے آیا خیال
ہنس کے دیکھا صبح کی رنگیں صباحت نے مجھے

فرصتِ سیر و تماشا کو غنیمت جان کر
کر دیا بیزارِ خلوت دل کی حسرت نے مجھے

دیر تک مجھ کو رہا ساقی کا اپنے انتظار
خوب گردش دی صبوحی کی ضرورت نے مجھے

تھی ابھی تاخیر معمولاً "طلوعِ حسن" میں
شعلہ برپا کر دیا تھا دل کی وحشت نے مجھے

اپنے پیالوں سے چھلکا کر محبّت کی شراب
ناگہاں آواز دی تاروں کی عصمت نے مجھے

غنچے نے سربستہ "سیمیں صراحی" پیش کی
دی گلابی تازہ پھولوں کی لطافت نے مجھے

میرے ہونٹوں تک بڑھایا اپنا ساغر چاند نے
صرفِ حیرانی کیا دُنیا کی وسعت نے مجھے

حملہ آور ہر طرف سے ہو گئی مجھ پر فضا
لے لیا آغوش میں جلووں کی جنّت نے مجھے

جب مری وحدت شعاری میں آیا انقلاب
جب بہ لطف اندوز دیکھا بزمِ فطرت نے مجھے

پیش لیلائے سحر نے کر دئے اپنے عذار
یا نوازا ایک دوشیزہ حقیقت نے مجھے

روح کی افسردہ سامانی میں لرزش آگئی
ہاتھ سے کھویا ہی تھا جوشِ مسرّت نے مجھے

میکدہ برلب یکایک میرا ساقی آگیا　　　کرلیا جذب اک تبسّم ریز طلعت نے مجھے

حُسن کی آغوش میں تسکینِ روحی مل گئی

صبح کو تابش ملی، مجھ کو صبوحی مل گئی

عرضِ تجلّی

فریبِ جلوہ ہیں یہ پردہ ہائے شبنم و گل　　　چمن طرازِ حقیقت مجھے خراب نہ کر

سرورِ بن کے سما جا نگاہِ حیراں میں　　　ہلاکِ جلوہ کو ناآشنائے خواب نہ کر

شگفتِ لالہ میں کر سیرِ خونچکانیٔ دل　　　کلی میں چھپ کے تماشائے اضطراب نہ کر

شعاعِ صبحِ چمن سے نہ آفتاب گرا　　　حدودِ شوق میں تخلیقِ التہاب نہ کر

رجوع اپنی طرف کر کے بے نیاز نہ ہو　　　لبوں سے کھینچ کے آزردۂ شراب نہ کر

انیسِ حسرتِ نظّارہ کر تجلّی کو　　　رہینِ مصلحتِ گوشۂ نقاب نہ کر

بنا صنم کدۂ آذری گلستاں کو　　　کسی کے ذوقِ پرستش سے اجتناب نہ کر

اُلٹ بھی دے سمن و نسترن کے پردوں کو　　　مری نظر سے ہم آغوش ہو حجاب نہ کر

فضول اسیرِ سراپردۂ نمو تُو ہے

مجھے ہی علم کہ پھولوں میں رنگ بو تُو ہے

برقِ سرِ رہگزار

سرگشتۂ جادہ تھا نظارہ آوارہ — جب چرخ پہ باقی تھا شاید ہی کوئی تارہ
تصویرِ سحر کی جب مائل بہ صباحت تھی — آئینۂ بے جوہر جب چاند کی صورت تھی
جب آنکھ چمن کی تھی لبریز تجسّس سے — جب راستے خالی تھے ناپاک نفس سے
چڑیوں کے ترنم سے معمور فضائیں تھیں — پھولوں کے تبسّم سے، رنگین ہوائیں تھیں
کیوپڈ ابھی ترکش کو چھونے بھی نہ پایا تھا — ہر شے تھی دھندلکے میں۔ ہر چیز پہ سایا تھا
آہستہ ردائے شب سمٹی ہوئی جاتی تھی — خورشید کی انگڑائی کرنوں کو جگاتی تھی

کچھ ڈھونڈتی چتون سے، کچھ کھیلتی آنچل سے — اک برق نظر آئی ٹپکی ہوئی بادل سے
مستانہ خرام اُس کا اعلانِ قیامت تھا — ہر عشوہ کا فریں سامانِ محبّت تھا
ایک تیر تھا پیوستِ دامانِ فضا گویا — اک رنگ تھا ہمدوشِ امواجِ ہوا گویا
چتون جو نگاہوں سے شرمائی ہوئی سی تھی — جلوت کے تصور سے گھبرائی ہوئی سی تھی
دُھن رات کے پردے میں منزل پہ پہونچنے کی — وہ موج کو بیتابی ساحل پہ پہونچنے کی

ہمراز سے آہستہ وہ راز کی کچھ باتیں
اسرار سے وابستہ، رستے کی ملاقاتیں
بجلی کہوں یا رنگیں اک تیر کہوں اس کو
یا حسن کی منزل کا رہگیر کہوں اس کو

آہستہ چل آہستہ اے پیکرِ رعنائی
پامال نہ ہو جائے تخئیل تماشائی
دزدیدہ نگاہی سے اک جام پلائے جا
پُر شوق مسافر کے ارمان مٹائے جا
آہستہ چل آہستہ اے جلوۂ نورانی
بھر لینے دے نظروں میں جلووں کی دُرخشانی
دن بھر کے لئے تجھ سے اخذ ایک فسوں کر لوں
ہنگامۂ ہستی کو مانوسِ سکوں کر لوں
آہستہ چل آہستہ اے موجِ مئے ہستی
پی لینے دے آنکھوں سے یہ بہتی ہوئی مستی
ہے چاند بھی پوشیدہ اور ڈوب گئے تارے
اب صرف مجھی کو ہیں قسمت ترے نظارے
آہستہ چل آہستہ، اے طلعتِ شائستہ
اے برق کی ہمجولی، آہستہ چل آہستہ،
ہموار تمنّا کا سیلاب تو ہو جائے
کافر مرا نظّارہ سیراب تو ہو جائے

حُسن کو دعوتِ سکوں

(فطرتِ حُسن کے مطالعے کے بعد)

پھول اور کلیوں کو پرکھا، سبزہ زاروں کو پڑھا
کوہ اور صحرا کو جانچا، آبشاروں کو پڑھا
درس ہر ہنگامۂ خاموشِ ہستی سے لیا
بستیوں سے دور جا جا کر مزاروں کو پڑھا
دن کو سورج کی شعاعوں پر رہا مصروفِ غور
رات کو نکلے ہوئے خاموش تاروں کو پڑھا
ابر کے صفحوں پہ دُہرایا حدیثِ برق کو
چاند کی نظروں میں فطرت کے اشاروں کو پڑھا
اس دبستانِ جہاں میں تھا یہی مقصودِ عمر
یعنی لاکھوں کو پڑھایا اور ہزاروں کو پڑھا

باوجودِ علم لیکن میں سپر انداز تھا
جو سمجھ ہی میں نہ آیا، حسن ایسا راز تھا
اے کہ تو فطرت میں اپنی سبزۂ شاداب ہے
یا طلوعِ صبح ہے، یا مشرقِ مہتاب ہے
اے کہ تو خاموش موسیقی ہے بزمِ قدس کی
ساز تیرا آج تک بیگانۂ مضراب ہے
اے کہ ہے تیرا تخیّل رفعت و عظمت پسند
کہکشاں کی رفعتوں پر تیرا فرشِ خواب ہے
اے کہ تیرے دل میں ہے احساس کا دریا رواں
ذہن میں تعمیرِ مستقبل کا اک سیلاب ہے
اے کہ تو خود شعر ہے، خود شاعرِ سحر نوا
موجۂ افکار تیرا قلزمِ سیماب ہے
اے کہ تیری سادگی ہے جلوہ گاہِ رنگ و بو
اے کہ بے رنگی میں تیری ہے پناہِ رنگ و بو
پھول ہے تو صدق کی خوشبو سے مہکایا ہوا

یا ہے موتی، ابرِ میناگوں سے برسایا ہوا

ہے صباحت سے تری نورِ حقیقت بے حجاب

تجھ پہ اب تک رنگِ صبحِ خلد ہے چھایا ہوا

زندگی کی آگ ہیں، نور آفریں شعلے ترے

عشق کا سینہ ہے اِن شعلوں سے گرمایا ہوا

تُو بہ ایں اوصاف، ہے غم آشنا و سرگراں

شورشِ حرص و ہوا سے سخت تنگ آیا ہوا

آہ، تو بھی محشرِ عالم میں میری ہی طرح

جستجو میں ہے سکونِ دل کی گھبرایا ہوا

میرے دل میں بیٹھ جا، کیفِ دروں مل جائے گا

میرے دل کے ساتھ تجھ کو بھی سکوں مل جائے گا

ہیں ہوس کے سیکڑوں جنگل تری جانب درآ

عشق میں اور حرص میں آساں نہیں ہے امتیاز

ایک ربطِ سرمدی ہے حسن میں اور عشق میں

عشق ہے عبدِ مجازی، حُسن معبودِ مجاز

حسن جویائے محبت، عشق جویائے جمال
اوران دونوں کا ملنا عشرتِ نازونیاز
ربطِ حسن وعشق میں پنہاں ہیں اسرارِ سکوں
غزنوی کے کیف سے ہے مستیٔ زلفِ ایاز
مطمئن ہو کر کنارِ عشق میں ہو جلوہ گر،
ہے وہی دلدوز نغمہ، ہو جو ہم آہنگِ ساز
بے سکونی کا سبب یہ ہے کہ بے آئیں ہے تو!
اے سکونِ دوجہاں، خود دشمنِ تسکیں ہے تو!
لالہ زاروں، آبشاروں، اور کہساروں کو دیکھ
باغ میں پھولوں کو، خارستان میں خاروں کو دیکھ
ماسوا سے بے غرض، خاموش، یکسو، بے نیاز
کس قدر بے خود ہیں، فطرت کے طلبگاروں کو دیکھ
ہے جہاں نظارگی، لیکن یہ ہیں دور از نظر
ان کی فطرت میں ہیں کیسی رفعتیں، تاروں کو دیکھ
ہیں سبھی مے خانۂ ہستی میں ساقی در نگاہ

غور کی نظروں سے اس محفل کے سرشاروں کو دیکھ
دور کیوں جاتا ہے، ہیں خود ہوں ترے پیشِ نظر
تو تری جانب ہے میرے دل کے انگاروں کو دیکھ
شمعِ روحِ ماستی از دہر دل بیگانہ کن
گر سکوں خواہی توجہ جانبِ پروانہ کن

مساواتِ فطرت

معین کر لیا تھا فیصلے نے ابنِ آدم کے کہ یہ لمحے مسرت کے ہیں یہ اوقات ہیں غم کے
طلوعِ ماہ، اک تمہید تھی حسنِ تعین کی کیے جاتے تھے قائم جس پہ عنوان عیش و ماتم کے
تاثرِ عیش و غم کا، حسبِ منشائے طبیعت تھا کبھی رنگِ شگفتِ گل، کبھی انداز شبنم کے
جب آئی موج، دل بھاری کیا، آنسو بہا ڈالے کیا جب عزم، خط آنکھوں میں کھینچے ساغرِ جم کے
مگر فطرت، کہ قانونِ مساوات اس کا واحد تھا تبسم زیرِ لب تھی دیکھ کر یہ رنگ عالم کے
بالآخر جذبۂ غم نے جگہ لی نفسِ فطرت میں بساطِ عیش سمٹی، خون دل کا رہ گیا جم کے
ہوا دورِ مسرت ختم، عہدِ سوگوار آیا فضا پر چھا گئے تاریک بادل یاسِ پیہم کے
وہ احساسِ نشاط و جذبۂ عشرت ہوا دھندلا قریبِ ماہ بن کر دل کے داغِ خونچکاں چمکے

مسرت منقلب گردید عالم نالہ یکسر شد
ہلالِ عید و شمعِ شامِ مایوسی برابر شد

تم کاش وہی ہوتے!

اے کاش نہ تم جاتے خلوت سے خفا ہو کر
فردوسِ نظر بنتے تسکینِ وفا ہو کر
احساسِ دوری کے مغموم نہ ہوتا میں
جلووں کے تراکم سے محروم نہ ہوتا میں
میں جذب تمھیں کر کے اپنے دلِ سوزاں میں
ہر وقت جلا سکتا اک شمع شبستاں میں

تم کاش چمن ہوتے! گل ریز و بہار افشاں
جب چاہتا بھر لیتا نظروں کا تہی داماں
ہر صبح تبسّم سے کچھ پھول بناتا میں
ہر شام کی محفل میں گلچیں نظر آتا میں
خوشبو سے بساتا میں ہر وقت دماغ اپنا
اور تم کو سمجھ لیتا مہکا ہوا باغ اپنا

تم کاش فلک ہوتے! معمور ستاروں سے
میں تم کو چھوا کرتا نظروں سے اشاروں سے
ہر وقت جواں رہتا میرا دلِ ناکارہ
ہوتا نہ قیامت تک برہم مرا نظّارہ

جس وقت جہاں جاتا تم سامنے آجاتے
فردوسِ نظر بن کر آنکھوں میں سما جاتے

تم کاش ندی ہوتے! قائم بھی خراماں بھی
مرکز سے گریزاں بھی مرکز ہی پہ رقصاں بھی
نظّارہ تماشا سے سیراب ہوا کرتا
ہردم دلِ افسردہ شاداب ہوا کرتا

ہر وقت ہوا کرتی تزئین نگاہوں کی
جب چاہتا کر لیتا تسکین نگاہوں کی

تم کاش وہی ہوتے جو میری تمنّا ہے
وہ پیشِ نظر رہتا جس کا مجھے سودا ہے
کندہ تمہیں کر لیتا یوں دل کے نگینے میں

تم میرا نفس بن کر رہتے مرے سینے میں

یا جسم مرا ہوتے، یا روح مری ہوتے

جو کچھ میں سمجھتا ہوں، تم کاش وُہی ہوتے!

محبّت

(سیاسی نقطۂ نگاہ سے)

خدا سمجھے تو امینِ جہانِ مادّیت کو
غرض مندی کا اک آلہ بنا ڈالا محبت کو

"محبت خود غرض ہے، عشق ہے اک جوشِ نفسانی"
نہ آئی شرم اس اعلان سے اہلِ سیاست کو

یہ تنقیدِ غلط ہی حسن کو بدظن بناتی ہے
سمجھتا ہے ہوس، وہ جذبۂ اربابِ الفت کو

محبّت کی سیاست پوچھ اُن خود آشناؤں سے
جو فرشِ خاک پر بیٹھے ہوں ٹھکرا کر حکومت کو

محبّت کونسل میں اور عدالت میں نہیں ملتی
دلِ ویراں میں ڈھونڈا اس ماہتابِ بزمِ فطرت کو

یہ ہے وہ علم جس کی عرش سے تعلیم ہوتی ہے
سیاست خاک پہچانے محبّت کی حقیقت کو

فنائے روح ہے ذوقِ محبّت کی گراں جوشی

ہے خود غرضی سیاست، اور محبت خود فراموشی

یاد آتا ہے کہ تھا عیشِ ازل میرے لئے　　زندگی تھی صبح کا تازہ کنول میرے لئے
کارفرما بے سکونی تھی نہ میرے ذہن میں　　میری ہستی نازشوں کا تھی محل میرے لئے

رنگ و بُو سے بے نیاز
ماؤ تُو سے بے نیاز
آرزو سے بے نیاز
جستجو سے بے نیاز

تھا نہ عالم ایک نامعلوم عالم کے سوا
کچھ نہ تھا اک نیند اور اک کیفِ مبہم کے سوا

ناگہاں اس نشہ سے مستی نئی پیدا ہوئی　　مستیٔ نوخیز سے ہستی نئی پیدا ہوئی
عالمِ بالا کی مجھ پر تنگ تھیں گنجائشیں　　دفعتاً میرے لئے پستی نئی پیدا ہوئی

رنگ بیز و بادہ بار
صد تماشا در کنار

ہر طرف کچھ لالہ زار

کوہسار و جوئبار

عشق کا دل محفلِ نو دیکھ کر للچا گیا

حسن کے رنگین ہونٹوں پر تبسم آ گیا

"آن" سے اور "اُنس" سے ترکیبِ انسانی ہوئی یعنی "حسن" و "عشق" کی وابستہ دامانی ہوئی

ہر طرف برپا ہوا اک محشرِ ناز و نیاز کچھ نئے انداز سے تہذیبِ ویرانی ہوئی

حسن تھا گیسو بدوش

شورش و ہنگامہ کوش

عشق تھا وحشت فروش

بے نیازِ عقل و ہوش

گرمیٔ نظّارہ دنیا کا تجلّی خانہ تھا

ہر کلی اک شمع تھی ہر پھول اک پیمانہ تھا

رنگ کیا لایا مرا سوزِ محبت، کچھ نہ پوچھ میں ہلاکِ جلوہ ہوں میری حقیقت کچھ نہ پوچھ

بن گیا میرا سراپا اک جراحت ایک داغ مجھ پہ کیا گزری مآلِ کارِ وحشت کچھ نہ پوچھ

آج تک دیوانہ ہوں

بے خود و بیگانہ ہوں

عبرتِ ویرانہ ہوں

ہیبتِ افسانہ ہوں

"سرگزشت از من چہ پرسی بشنو از من سرگزشت"

"موئے سر از پا گزشت و خارِ پا از سر گزشت"

سایۂ زہرا میں

فطرتاً جذباتِ حسن و عشق میں ہے ارتباط
ہے زمیں سے تا فلک ان کی بساطِ انبساط

جھومتا ہے عشق دل بن کر فضائے شوق میں
اپنی دُھن میں چھیڑتا ہے حسن جب سازِ نشاط

زحمتِ زنجیر سر ہے پائے محبت میں فضول
قید ظاہر سے ہے بالاتر یہ ربط و اختلاط

ختم ہو سکتی نہیں ان کی یہ جنگِ زرگری
شوق صَرفِ برہمی و عقل محوِ انضباط

رسم و آئینِ تمدن کو ہوئی آخر شکست
سب نے جرأت آزمائی کی بمقدارِ بساط

عالمِ اجسام پر طاری ہوں کتنے ہی حجاب
روح کی دنیا نہیں پابندِ حزم و احتیاط

نیند کی غفلت سے جب اہلِ جہاں بیہوش تھے

سایۂ زہرا میں حسن و عشق ہم آغوش تھے

مغالطہ

اکثر جمالِ شب میں دیکھی ہے صبح میں نے
اکثر ہوا ہے دھوکا ظلمت پہ چاندنی کا

اکثر مرا تصوّر تصویر بن گیا ہے
جب ذہن میں اُٹھا ہے طوفان بیخودی کا

دیکھی ہے آئینے میں سیرِ شبِ چراغاں
تیرا ہوں عکس بن کر تاروں کی روشنی کا

حسنِ اجل بکف کو وجہِ حیات جانا
جامِ شفق کو سمجھا کفارہ تشنگی کا

اپنی طرف کیا ہے شورش نے مجھ کو مائل
دے کر فریبِ باطل نغمات سرمدی کا

کنجِ چمن میں میں نے جنت کے خواب دیکھے
آنکھیں کھلیں تو رو یا منہ چوم کر کلی کا

انسانیت سرابِ اُنس و خلوص نکلی
سمجھا تھا آدمی کو ہمدرد آدمی کا

مجبوریوں میں پایا رازِ نہانِ اُلفت
خود غرضیوں میں دیکھا انداز عاشقی کا

غازہ کبھی ریا کا سمجھا میں سادگی کو
رنگینیوں میں جھلکا آئینہ سادگی کا

آتا رہا نشاطِ دل پر یقین مجھکو
زندانِ آب و گل کو سمجھا میں گھر خوشی کا

بربادیتیں تھیں تعبیرِ خوابِ ہستی
پایا اجل کدے میں احساس زندگی کا

کچھ شعبدے خودی میں، کچھ سحر بیخودی میں
کیا کیا مغالطے تھے اک خوابِ زندگی میں

شاعر کا دل

پھول کی خوشبو، شفق کی لَو، سحر کے نور سے | نغمۂ ناہید سے ماہیتِ کافور سے
ایک پیمانہ بنایا فطرتِ سرشار نے | کر دیا لبریز اُسے کیفیتِ مستور سے
سوز کا اُس پر چڑھایا اک غلافِ تابناک | اور پھر انسان کے پہلو میں پھینکا دور سے

جس نے دیکھا آگ کا طوفاں سمجھ کر رہ گیا
اور شاعر اُس کی موجوں میں اُلجھ کر رہ گیا

پہلوئے شاعر میں دل آیا کہ دنیا آ گئی | خلوتِ تیرہ میں تنویرِ سویدا آ گئی
شاہراہِ عرش، چشم و گوش پر کھلنے لگی | تا بہ لب الہام کی اک موج گویا آ گئی
اُٹھ گئے حدِ نظر تک چشمِ ظاہر سے حجاب | سامنے لیلائے فطرت بے محابا آ گئی

"شاعر" اس فطری عطائے خاص پر خوش ہو گیا
کیف وہ دل میں ہوا پیدا کہ سرخوش ہو گیا

اضطراب اُس پر ہوا طاری وطن کے درد سے | ہو گیا وہ آشنا دشت و چمن کے درد سے
جا کے ویرانوں میں رویا تشنگیِ خار پر | انجمن میں نالہ کھینچا انجمن کے درد سے

پا بگل ان کو حدودِ گلستاں میں دیکھ کر　　　چیخ اٹھا کاوشِ سرو سمن کے درد سے

کوئی جلوہ بھی نہ پھر باطل نظر آیا اُسے

سینۂ ہر ذرہ میں اک "دل" نظر آیا اُسے

بزمِ حسن و ناز میں جب اُس نے چھیڑا اپنا ساز　　　حسن کے سنگین دل میں کر دیا پیدا گداز

عشق کے ایواں میں رکھا اُس نے جب اپنا قدم　　　غزنوی کے دل میں کھولا عقدۂ زلفِ ایاز

قصۂ دیر و حرم کو ختم اس نے کر دیا　　　پاؤں پر ساقی کے سجدہ، دامنِ بت پر نماز

صبح تک بھیگی ہوئی راتوں میں وہ روتا رہا

اُس کا دل جاگا کیا، مرغِ سحر سوتا رہا

اے دلِ شاعر، منور قطرۂ نیسانِ عرش　　　سینۂ شاعر میں تو ہے شعلۂ جولانِ عرش

تیرے ظرفِ فکر میں ہے وسعتِ کون و مکاں　　　مختصر ترکیب تیری نقشۂ ایوانِ عرش

نغمۂ تاباں ترا آبادیٔ دنیائے قدس　　　جلوۂ پنہاں ترا شمعِ تہِ دامانِ عرش

عرش کی خلوت سے جب فطرت کا دل گھبرائیگا

عرش تیرا ہی دلِ ویراں بنایا جائیگا

نزاکتِ احساس

مرا احساس جو تاروں کی کرنوں سے بھی نازک ہے
جو نازک فکر شاعر کے خیالوں سے بھی نازک ہے

لطافت جس کی پچھلی رات کے پھولوں میں پلتی ہے
جو وقتِ صبح بوئے گل کی موجوں میں نکلتی ہے

گوارا اس کو ہو گی چوٹ کیونکر نشترِ غم کی
حقیقت جو رگِ گل کی ہو، اور فطرت ہو شبنم کی

بقائے حسن اس عالم میں ہے احساس سے میرے
فروزاں زندگی کی آگ ہے انفاس سے میرے

مرا احساس آب و رنگ کی گرمی بڑھاتا ہے
جبینِ حُسن پر تنویر بن کر مسکراتا ہے

پذیرائی مرے احساس کی اے حسنِ فانی کر
بسر اس کی پناہوں میں شبابِ زندگانی کر

مرے احساس میں تکمیل شانِ خود نمائی ہے
غلامی ہی مرے احساس کی تیری خدائی ہے

مرے احساس کی تیزی کو تو تلوار سمجھا ہے
مرے احساس کو تو نشترِ پندار سمجھا ہے

تجھے شبنم پہ عالم سوز چنگاری کا دھوکا ہے
فرشتوں کے تقدس پر سیہ کاری کا دھوکا ہے

تو سمجھا ہی نہیں احساس کی غمگیں نواؤں کو
کہانی جانتا ہے درد میں ڈوبی صداؤں کو

غلط اندیش اک دل اور دل کے پاس پیدا کر
پھر اس دل میں مسلسل جذبۂ احساس پیدا کر

اگر تجھ کو مرے احساس کا احساس ہو جائے
تو دنیائے تمنا بے نیازِ یاس ہو جائے

رقصِ برگ

گلشنِ ہستی میں اے دیوانۂ موجِ ہوا
زہر سے لبریز ہے پیمانۂ موجِ ہوا

پھول جب تک شاخ سے اپنی جدا ہوتا نہیں
مبتلائے شورشِ موجِ ہوا ہوتا نہیں

متحد جب تک ہیں تارے عالمِ افلاک پر
زندگی رقصاں ہے ان کے دیدہ ضوناک پر

جو مسافر کارواں سے اپنے آوارہ ہوا
وادیٔ غربت کا وہ بے نور سیارہ ہوا

قصر سے جو خشتِ بے بنیاد باہر آ گئی
اس سے نفرت کی زمیں نے، خاک اُس کو کھا گئی

ابر کی آغوش سے قطرہ جو نکلا بے قرار
گرمیٔ فطرت نے اُس کو کر دیا جذبِ شرار

برگِ گل کے جی میں آئی تیتری کو دیکھ کر
"کاش میں بھی رقص کرتا سبزۂ شاداب پر

کاش آزادی مجھے بھی اس طرح ہوتی نصیب
منعقد کرتا میں اپنی انجمن دور و قریب

تیتری کو دیکھ کر جذبوں میں اک جوش آ گیا
شاخ کی پابندیوں سے دل مرا گھبرا گیا"

ناگہاں دستِ ہوا نے کر دیا رسوا اُسے
صورتِ خس کر دیا گلشن میں آوارا اُسے

یوں دیا فطرت نے اپنی عزم فہمی کا ثبوت
کر دیا اس پر مسلط ایک تارِ عنکبوت

تار میں وہ برگِ گل کچھ دیر تک جھولا کیا
نیم آزادی میں، دنیا کی ہوا کھایا کیا

بادِ صرصر نے گرایا آخر اس کو خاک پر
موت غالب آ گئی اس کی ہستیٔ بیباک پر

ٹھوکریں کھاتا رہا وہ شوخیٔ رہگیر کی
مسکرائیں پستیوں پر لعنتیں تقدیر کی

چاہتا تھا جست پھر اک جانب بالا کرے
پتّے جو شاخوں میں تھے، سب کھلکھلا کر ہنس پڑے

اپنے مرکز تک اُسے پرواز کی جرأت نہ تھی
قوتِ نشو و نما پر اب اُسے قدرت نہ تھی

روح نکلی، رنگ بدلا، تازگی کمہلا گئی
دیکھتے ہی دیکھتے پتّے کو مٹی کھا گئی

اب نہ تھا وہ رقص اس کا اب نہ وہ آزادیاں
موت بن کر چھا گئیں انجام کی بربادیاں

دفعتاً آندھی اُڑا کر خاک اُس کی لے گئی
بنکے گردش، آرزوئے رقص دھوکا دے گئی

اپنے مرکز سے جدا ہو کر جو ٹھوکر کھائے گا
وہ یونہی اک روز دنیا میں فنا ہو جائے گا

قوتِ کامل ہیں اس دنیا میں ربطِ اتحاد
ان کی قوت پر ہوا کرتا ہے قوموں کا جہاد

ہے اگر ثابت قدم، تقلیدِ سیّارہ نہ کر
رقصِ آزادی کی دھن میں خود کو آوارہ نہ کر

حُسنِ آوارہ

تو سمجھتا ہے کہ آوارہ ہے شبنم کا مزاج
ہے شعاعِ مہر ننگِ صبح و رسوائے چمن

نکہتِ آزاد ہے اک موجۂ حرص و ہوا
ہے شمیم اک موجِ بے پروائے مینائے چمن

روشنیٔ صبح، عالم دوست ہے ہرجائی ہے
جو برستی ہے افق سے تا بہ پہنائے چمن

تو سمجھتا ہے یہ غنچے اور یہ رنگین پھول
تاجرانِ رنگ و بو ہیں بہرِ دنیائے چمن

تو سمجھتا ہے نسیم اک فتنۂ تخریب ہے
ایک مشاطہ جو ہے تصویر آرائے چمن

ہے یقیں تجھ کو کہ ہر رنگین و نازک تیتری
ہے تقاضائے ہوس سے رقص فرمائے چمن

تجھ کو باور ہے کہ ہر وہ چیز جس میں حُسن ہو
ایک عریانی ہے تا حدِ تماشائے چمن

چاندنی ہے دھوپ ہے جگنو ہے یا سیارہ ہے
تیری نظروں میں یہ ہر معصومیت آوارہ ہے

تیرے اس احساس سے بالا ہے ادراکِ جمال
باطل آرائے گل و لالہ ہے نزہت حسن کی

ساری جنت کا اچھوتا پن ہے نفسِ حسن میں
حور کی عصمت سے ہے ماخوذ عصمت حُسن کی

حسن اپنے کیف میں خود بے خود و سرشار ہے
اس لیئے ہے ماسوا سے سیر نیّت حُسن کی

حسن ہے عینِ حقیقت حُسن ہے عینِ خدا
جو سرشتِ روح ہے وہ ہے طبیعت حُسن کی

عشق نے پیدا کیا ہے اس کے دل میں انتشار
تازہ پھولوں سے بھی نازک تھی لطافت حُسن کی

کھینچتا ہے عشق اس کو پردہ ہائے راز سے
ورنہ ہے ادراک سے بھی دور خلوت حسن کی

جس میں ہو آوارگی وہ حسن ہو سکتا نہیں
یعنی ہے "سرمایۂ محفوظ" دولت حسن کی

عشق کہتا ہے کہ فطرت حسن کی آوارہ ہے
حسن کہتا ہے کہ رسوا عشق کا نظّارہ ہے

تخریب

شورشِ تخریب میں ہے عقل انساں کی خراب
آ بتا دوں میں تجھے تخریب کا لُبِّ لباب

رازِ بربادی نئی تہذیب نے سمجھا نہیں
علم و ادراک بھی اس کا ہے محدودِ کتاب

جتنی فانی لذتیں ہیں اس جہانِ خواب کی
انحطاط اُن کا نتیجہ ہے، مآل ان کا عذاب

محترز انساں اگر لذاتِ ناقص سے رہے
ہو رہا قیدِ فنا سے مثلِ ماہ و آفتاب

کامیابی فی الحقیقت آرزو کی موت ہے
ہے وُہی ناکام جس کی آرزو ہے کامیاب

کامگاری ہی بہ الفاظِ دگر تخریب ہے
حاصلِ ہر لذتِ نفس و نظر تخریب ہے

صبح کا چاند

پھینک کر دنیا پہ زنجیرِ طلائی رات بھر / کر کے بحر و دشت میں جلوہ نمائی رات بھر

جگمگا کر ساری دنیا کو شعاعِ نور سے / اور پھیلا کر ضیا اپنے چراغِ دُور سے

بحر کی موجوں کو دے کر اذنِ جوشِ ارتعاش / جذب کر کے نہر میں اپنا جمالِ نور پاش

بیٹھ کر تاروں کی محفل میں سحر تک بے نقاب / سطحِ عالم پر بہا کر اپنی کرنوں سے شراب

پا شکستہ قافلے کو تا بہ منزل چھوڑ کر / پھول کے سینے میں اک تڑپا ہوا دل چھوڑ کر

چاندنی کے پھول کو دے کر جوانی نور کی / چھوٹ برسا کر زمیں پر آسمانی نور کی

دفعتاً مدھم ہوئی کیوں تابشِ کامل تری؟ / یک بیک خاموش کیوں ہونے لگی محفل تری؟

کیوں ترا پیمانۂ رنگیں چھلک کر رہ گیا؟ / کیوں یہ تیرا شعلۂ زریں بھڑک کر رہ گیا؟

رات بھر تو ظلمتوں پر نور برساتا رہا / شوخیاں کرتا رہا۔ ہنستا رہا۔ گاتا رہا

صورتِ شمعِ سحر کیوں رنگ ہے پھیکا ترا / چھین کر کس کی نگاہیں، لے گئیں جلوا ترا

ساغرِ تاباں ترا کیوں رہ گیا ہے ٹوٹ کر / کیا تو واماندہ ہے اپنے کارواں سے چھوٹ کر؟

غالباً بیدار کوئی جلوۂ معصوم ہے / جس کے نظارے سے تیری روشنی معدوم ہے

خواب سے لیتا ہوا انگڑائی اُٹھا ہے کوئی
دیکھ کر آئینہ تیرا مسکرایا ہے کوئی

ہے اثر سے حسن کے شرمندہ و محجوب تو
اس لیے موجِ ندامت میں گیا ہے ڈوب تو

یا جو شعلہ سا ہوا ہے جانبِ مشرق بلند
اُس کی گرمی سے تری طلعت کو پہونچی ہو گزند

اے کہ تو اک پیکرِ بے نور آتا ہے نظر
لے گیا کوئی تری روحِ حقیقت کھینچ کر

ہے فنا انجام تو بھی جیسے بہاریں باغ کی
اور لافانی ہو تابش میرے دل کے داغ کی

اب میں سمجھا کیوں تری ہستی زوال اندوز ہو
تو سراپا ساز ہے اور دل سراپا سوز ہو

شہابِ ثاقب

دراز دستیِ گلچین و موجِ شوخِ ہوا
چمن سے ہستیِ گل کو کوئی مٹا نہ سکا

شکستِ جام و سبو کو ملی حیاتِ جدید
جہانِ میکدہ میں انقلاب آ نہ سکا

ستارہ ٹوٹ کے پھر ہو گیا فروغِ نظر
چراغِ بزمِ فلک کے کوئی بجھا نہ سکا

مگر ستم کشِ شبہائے غم کے پہلو میں
وہ دل جو بیٹھ گیا پھر نمود پا نہ سکا

شگفتِ خاطرِ برہم زدہ، در امکان نیست
دلِ شکستہ و نجمِ شکستہ یکسان نیست

میر ناصر علی خاں

۵۲ ھ ۱۳

اے چراغِ بزمِ دوشیں کی ضیائے آخری ‌‌ گلشنِ دہلی کی اے رنگیں نوائے آخری

آہ کس منہ سے کہوں تو خاک میں خوابیدہ ہے ‌‌ سامنے نظروں کے تیرا پیکرِ کاہیدہ ہے

کھل گیا سوزِ دروں سے شمعِ سوزاں کی طرح ‌‌ رخصت آخر ہو گیا دودِ پریشاں کی طرح

داغِ نو اردو کے صد پارہ جگر کو دے گیا ‌‌ آہ اپنا رنگ بھی تو ساتھ اپنے لے گیا

فلسفہ اب وہ تر لفظوں میں سمجھائے گا کون؟ ‌‌ اب بساطِ انجمن پر پھول برسائے گا کون؟

نغمہ بیزارِ رباب و چنگ ہے تیرے بغیر ‌‌ بزمِ اردو مطلقاً بے رنگ ہے تیرے بغیر

اہلِ عالم کو نوا تیری "صلائے عام" تھی ‌‌ جنبشِ لب ترجمانِ عقدۂ الہام تھی

گیسوئے اردو کی اب مشاطگی ممکن نہیں ‌‌ اور سب باتیں تو ممکن ہیں یہی ممکن نہیں

بزمِ داغ و محفلِ غالب خیابانِ نذیر ‌‌ سب کی رونق تجھ سے تھی اے یادگارِ سوز و میر

ذہنِ شاعر کی نزاکت عشق کے سینے کا راز ‌‌ حسن کی پنہاں حقیقت کیف و کم کا امتیاز

تھی امیں ان سب خزانوں کی تری فکرِ بلند ‌‌ شوخیاں کرتی تھی بامِ عرش سے جس کی کمند

قلزمِ تحقیق میں بہتا چلا جاتا تھا تو
تہہ سے طوفانوں کی موتی ڈھونڈ کر لاتا تھا تو
سخت عنوانوں پہ دل میں چبھنے والے حاشیے
سیکڑوں نظموں سے بہتر چار ٹکڑے نثر کے
آہ، وہ اُردو میں وارفتہ نگاری اب کہاں؟
حُسن کی لَے میں حدیثِ بیقراری اب کہاں؟

اے مسافر، ہو ترا اللہ ناصر، الوداع
اے جہانِ آباد کی آوازِ آخر، الوداع

فلسفۂ زوال

نہ ہو افسردہ خاطر انقلابِ بزمِ امکاں سے
یہاں صحرا ہمیشہ بنتے آئے ہیں گلستاں سے
فنا ہے ایک عالم کی نمودِ عالمِ دیگر
بنائے قصر ہے تاراجیٔ خاکِ بیاباں سے
چمن کی آبرو دَر رنگ ہیں آنسو ستاروں کے
نمودِ لالہ و گل ہے سرشکِ ابرِ باراں سے
زوال اک باطنی تمہید ہے آثارِ رفعت کی
حدودِ شام ہم آغوش ہیں صبحِ درخشاں سے
غمِ واماندگی کو فرصتِ آرام ملتی ہے
فضا پھر گونجتی ہے کاروانِ خفتہ ساماں سے
خطِ ہستی پہ چلنا، نقطۂ آخر سے لوٹ آنا
یہ جادہ رات دن پُرشور ہے رفتارِ انساں سے

زوال اک ساعتِ لرزیں ہے دَورِ ارجمندی کی
نہ ہو پستی تو پھر تمیز کیونکر ہو بلندی کی

شاعر کی موت

بہرِ انساں موت تو فطرت کا اک قانون ہے
فطرتِ شاعر بقائے خاص کی ممنون ہے

نفسِ شاعر فطرتاً نقشِ فنا پیرا نہیں
یعنی اس کی زندگی میں موت کا جھگڑا نہیں

زندگی اس کی نشاطِ روح کی تفسیر ہے
موت اس کے محو ہو جانے کی اک تصویر ہے

زندگی میں مرحلے طے موت کے کرتا ہے یہ
سیکڑوں بار اس فنا آباد میں مرتا ہے یہ

"موت قبلِ موت" اس کا مسلکِ دیرینہ ہے
روح اس کی آئینہ، یہ جوہرِ آئینہ ہے

زندگی بنتی ہے اس کے مبدءِ افکار سے
بھاگتی ہے موت اس کی ایک ہی للکار سے

عمر بھر دیتا ہے یہ دنیا کو پیغامِ بقا
عالمِ فانی میں کرتا ہے سرانجامِ بقا

آ کے جس منزل پہ مر جاتا ہے ہر سرمایہ دار
زندگی شاعر کی کرتی ہے وہاں آغازِ کار

سطوتِ شاہنشہی تھک کر ٹھہرتی ہے جہاں
کارواں شاعر کا اُس منزل سے ہوتا ہے رواں

ماند پڑتی ہے، جہاں ذہنِ مصور کی تپش
آگ بنتی ہے وہاں سے فکرِ شاعر کی روش

چند صدیوں تک کوئی انسان پا سکتا ہے نام
نام کو شاعر کے لیکن ہے زمانے میں دوام

کاوشِ یک عمر سے ہوتا ہے جب جینا عذاب — فطرتاً ہوتا ہے شاعر مائلِ مجبورِ خواب

ڈھونڈتا ہے پُرسکوں اپنے لئے اک خوابگاہ — چھپ کے چشمِ خلق سے لیتا ہے تربت میں پناہ

موت خود کرتی ہے اُس کا اہتمامِ زندگی — اُس کو شہرت دینے آتی ہے پیامِ زندگی

گونجتی رہتی ہے اس کی بزمِ عالم میں صدا — خامشی دیتی ہے اُس کے ساز کو رنگِ نوا

مسکراتا ہے وہ اپنی نظمِ گوہر بار میں — روز کر لیتا ہے باتیں پردۂ اشعار میں

خونِ دل اس کا برستا ہے شفق کے رنگ پر — وہ نئے نغمے سناتا ہے سحر کے چنگ پر

شام کو ہوتا ہے روشن اس کا فانوسِ خیال — رات کی ہیبت سے ہوتا ہے عیاں اُس کا جلال

برق بن کر ابر میں رقصاں نظر آتا ہے وہ — رنگ بن کر پھول میں پنہاں نظر آتا ہے وہ

روح اس کی وادیوں میں اینڈتی ہے شعر خواں — اُس کی اک آواز ہوتی ہے درائے کارواں

درس دینے کے لئے ہر رنگ میں آتا ہے وہ

زندگی بن کر بھری محفل پہ چھا جاتا ہے وہ

محشرِ ہستی میں شاعر دائمی اک صور ہے — جس کو کہتے ہیں فنا، وہ اس سے کوسوں دور ہے

ہاں مگر آتا ہے اُس پر ایک وقتِ ناگوار — جب وہ اپنے ذہن میں محسوس کرتا ہے فشار

ٹوٹتا ہے رشتۂ الہام اُس کے ساز سے — دُور ہو جاتا ہے وہ پردہ سرائے راز سے

تنگ ہو جاتی ہیں اُس پر وسعتیں تخئیل کی — سُن نہیں سکتا صدائیں شہپرِ جبریلؑ کی

کیف سے محروم ہو جاتا ہے جب مینائے دل
اس کو گرماتی نہیں جب گرمیٔ سینائے دل

روح میں جب اُس کی سامانِ طرب ہوتا نہیں
شعر موزوں باوجودِ فکر جب ہوتا نہیں

جب نظر آتا ہے وہ بے چین سا بیتاب سا
اور ہو جاتا ہے آنکھوں پر مسلط خواب سا

دل کی بیداری کو ہو جاتا ہے خطرہ فوت کا
بس وُہی لمحہ ہے شاعر کی مجازی موت کا

غالب

ایکہ تو رازِ "بقا اندر فنا" فہمیدہ ہے
بے نوا ہو کر حجابِ خاک میں خوابیدہ ہے

محو ہے شاید کسی مضمونِ نو کی فکر میں
تیری خاموشی بھی ہر اک شعر گو پیچیدہ ہے

اے ستم پر وردۂ آب و ہوائے "ارضِ تاج"
مدتیں گزریں کہ تو دلّی میں آرامیدہ ہے

آج تیری آگ سے معمور ہے تیرا وطن
تیرے ہی سوزِ صدا سے اُس کا دل تفتیدہ ہے

روح بن کر تو ہے بزمِ شعر پر چھایا ہوا
رنگ تیرا دیدہ ہے صورت تری نادیدہ ہے

ذہنِ شاعر کو تصور سے ہیں تیرے رفعتیں
فکر افسردہ تصور سے ترے بالیدہ ہے

فلسفۂ اردو ادب کا جزوِ غالب ہو گیا
دوشِ مشرق قابلِ گیسوئے مغرب ہو گیا

میرے احساسات تو کیا پوچھتا ہے ہم نشیں — حُسن میں اور عشق میں کوئی توازن ہی نہیں

وہ اُدھر مصروفِ سیرِ لالہ و گل باغ میں — میں اِدھر تاریکیٔ خلوت میں افگندہ جبیں

وہ اُدھر محوِ تماشائے بہارِ زندگی — میں اِدھر جذبات کی کاوش سے مرنے کے قریں

وہ اُدھر رنگیں لبوں سے انجمن میں رنگ بار — میں اِدھر خاموش، بیدل، بیقرار، اندوہگیں

وہ اُدھر بھولے ہوئے رسمِ وفا وعدے کے بعد — میں اِدھر سادہ دلی سے نیک ظن و خوش یقیں

وہ اُدھر سرمستیوں سے، صد بہار و صد نشاط — میں اِدھر نالہ بلب اور چشم تر بر آستیں

وہ اُدھر اپنی خودی کے زعم میں آزادرو — میں اِدھر اُس کی پرستش کے لئے خلوت گزیں

وہ اُدھر میرے خیالِ مضطرب سے بے نیاز — میں اِدھر اُس کے تصور میں پریشان و حزیں

وہ اُدھر عیش و مسرّت کی فضا میں نغمہ بار — میں اِدھر زحمت کشِ طوفانِ آہِ آتشیں

وہ اُدھر سرمست، سرخوش، سربلند و سرفراز — میں اِدھر عجز و نیازِ دل سے پیوندِ زمیں

وہ اُدھر بیگانگی کا ایک نقشِ پُر فریب — میں اِدھر ذوقِ وفا کا اک مرقع بہتریں

وہ اُدھر دنیا سے مصروفِ گناہِ التفات　　میں اِدھر اُس کی ہوا میں فارغِ دنیا و دیں

وہ اُدھر لاکھوں اداؤں سے کہیں محوِ خرام　　میں اِدھر دو منتظر آنکھوں سے قلزم آفریں

حسن کے اور عشق کے عالم میں کتنا فرق ہے

ایک پھولوں کا تبسم ایک موجِ برق ہے

شہرت اور موت

موت کو اجزائے ہستی پر ملا جب اختیار　　دولت و شہرت کو بھی اس نے کیا اپنا شکار

عالمِ فانی کی دولت ایک فانی چیز تھی　　موت کا جھونکا جو آیا اُڑ گئی مثلِ غبار

شہرت اس دنیا کی تھی در اصل آدھی زندگی　　اُس نے جب دیکھا کہ ہے خطرے میں اس کا اقتدار

بوئے گل بن کر حجابِ گل میں پنہاں ہو گئی　　جب ملا موقع، ہوئی موجِ ہوا سے آشکار

موت کی جاذب نگاہیں جب نہ اس کو پا سکیں　　ہر روش پر کر دئے پیدا ہزاروں انتشار

حاملِ شہرت کو جب اس نے ملایا خاک میں　　شہرت اُس پر چھائی آکر صورتِ ابرِ بہار

موت کے منھ سے شہیدوں کو مبارکباد دی　　سرفروشوں کی لحد پر بن گئی شمعِ مزار

سعیٔ شہرت کر، کہ بیمِ فوت شہرت کو نہیں

موت کو شہرت ہے لیکن موت شہرت کو نہیں

آہ یہ قشقہ!

طلوع کون یہ ہوا، صنم کدے سے صبح کے؟
جبینِ مرمریں میں شمعِ بتکدہ لئے ہوئے

جگائے چتونوں میں اپنی ایک سحر حُسن کا
نظر میں بجلیاں، لبوں میں زمزمہ لئے ہوئے

خرام، آہ وہ خرام، جو ہے پائے ناز سے
دلوں کی پائمالیوں کا فیصلہ لئے ہوئے

قدم قدم پر ایک فتنۂ قیامت آفریں
نقوشِ پا میں آئینہ در آئینہ لئے ہوئے

جمال میں بھرے ہوئے ہزار درس عاشقی
خیال میں مسرتِ مطالعہ لئے ہوئے

وہ بال جن پر اپنی جان ابرِ نوبہار دے
وہ چال جو نگاہ کو پیامِ انتشار دے

جبیں پر ایک احمریں ستارہ، آفتِ نظر
وہ قشقہ جس پہ رنگ کفرِ حُسن کا چڑھا ہوا

حریمِ دیر میں لطیف شمع سی جلی ہوئی
سمن کدے میں اک شگوفۂ حسیں کھلا ہوا

خرامِ مست سے وہ اس کی شوخیاں بڑھی ہوئی
وہ ذوقِ سرخوشی مری نگاہ کا بڑھا ہوا

کنکھیوں سے وہ بار بار اُس کا مڑکے دیکھنا
حجابِ احتیاط میری آنکھ پر پڑا ہوا

نہ سیرِ حسرتِ نظر، نہ پُرسکون رہگزر
نگاہ مطمئن ہوئی، نہ ذوق کا بھلا ہوا

مثالِ خوابِ صبح، ایک عشرتِ نظر تھی یہ
سمجھ لیا کہ مختصر عبادتِ سحر تھی یہ

حُسنِ مجبور

حصۂ انساں ہو سوز و ساز کے سامان میں
حسن بھی انسان میں ہے عشق بھی انسان میں

قلبِ گیتی عشق کے پرتو سے آتش ناک ہے
حُسن کی رنگینیوں سے گل بداماں خاک ہے

عشق سے ہوتی ہے نور افروز شامِ کائنات
جاگتا ہے حسن سے گل خانۂ صبحِ حیات

چھیڑ کر فطرت نے اپنا سازِ جبر و اختیار
کر دیا انسان کو مجبورِ کرب و اضطرار

عشق نے مجبوریوں کی بےکسی محسوس کی
جذبۂ وارفتگی پر چوٹ سی محسوس کی

دفعتاً ہستی کی پابندی سے ہو کر بےنیاز
نالہ وہ کھینچا لرز کر رہ گئی بزمِ مجاز

خون وہ رویا، کہ اک عالم کفِ سیلاب تھا
شعلہ وہ پھینکا، جو برقِ خرمنِ اسباب تھا

عشقِ عالم سوز قیدِ جبر سے گھبرا گیا
جَست کی ایسی کہ فطرت کو پسینہ آگیا

بےخودی و محویت کی وسعتوں میں کھو گیا
شوق کی قوت سے آزادِ تعیُّن ہو گیا

حُسن نے آنکھیں جھکا کر کیں یہ زنجیریں قبول
بڑھ گیا افسانۂ رنگیں بہ عنوانِ فضول

جان ہے مشکل میں حُسنِ مشکلات آگاہ کی
ہر قدم پر ایک مجبوری ہے ٹھوکر راہ کی

عشق آزاد، اور رسمی الجھنوں میں پائے حسن
حسن خود توہین ہے اپنے لئے اے وائے حسن !

کاش فطرت غور کرتی حسن کی تقسیم میں
اک توازن کاش ہوتا دہر کی تنظیم میں

حسن اُسے ملتا جو لذت آشنائے عشق تھا
جس کا دل دنیا میں فطرت آشنائے عشق تھا

حسن اُسے ملتا جسے آزادیاں ہوتیں نصیب
ہر قدم پر کائنات ایجادیاں ہوتیں نصیب

حسن اُسے ملتا نہ ہوتا جو علائق کا غلام
توڑ سکتا جو رواج و رسم کی قیدیں تمام

حسن اُسے ملتا جسے ہوتی محبت کی تلاش
اور جس کی روح کو ہوتی حقیقت کی تلاش

حسن محوِ احتیاط و عشق آزادی شعار
ذوقِ حسن و عشق میں ہے اختلافِ ناگوار

اے محبت عشق کے دل سے یہ کاوش دور کر
حسن کو آزاد رہنے کے لئے مجبور کر

نویدِ فردا

اے کہ تیرا حُسنِ سادہ، صبحِ در آغوش ہے
اے کہ تیرا دل وفا گُستر، محبت کوش ہے

میکدے لاکھوں تری تمکیں نگاہی پر نثار
تیری آنکھوں میں نیا اک بادۂ سرجوش ہے

نغمہ پیرا ہے نوائے عرش تیرے ذہن میں
بربطِ الہام تیری فطرتِ خاموش ہے

ہے بقدرِ ظرف حصہ کیف باقی میں ترا
تو مرے میخانۂ اسرار کا مے نوش ہے

تجھ سے آسودہ ہے بے کیفی مرے جذبات کی
تیرا آب و رنگ تسکینِ خمارِ دوش ہے

چاند ہے تو آرزو کے آخری لمحات کا
تو اُجالا ہے مری محفل کی پچھلی رات کا

عالمِ باطل میں تجدیدِ حقیقت تجھ سے ہے
خود غرض دنیا میں تائیدِ محبت تجھ سے ہے

تو نے ناموسِ وفا کو اپنے دل میں دی پناہ
رسم و آئینِ صداقت کی حفاظت تجھ سے ہے

یہ سلیقہ، یہ سعادت، یہ متانت، یہ شعور
بزمِ انساں میں وقارِ آدمیت تجھ سے ہے

ماورائے آرزو نکلی تری طبعِ لطیف
سادگی ہائے تمنا کو ندامت تجھ سے ہے

تیرا باطن ضوفشاں ہے تیرے ظاہر کی طرح
رنگِ خلوت تجھ سے ہے، تزئینِ جلوت تجھ سے ہے

کون ہے تُو، یہ ابھی کوئی بتا سکتا نہیں
تیری ہستی کا سمجھ میں راز آ سکتا نہیں

ہے نویدِ عہدِ آیندہ تجھے لے نورِ جاں — حال تیرا کیف آور، تیرا استقبل جواں
اُس فضا میں جو ابھی دُنیا کی نظروں سے ہے دُور — ہے تکلّم اب بھی تیرا نغمہ ریز و نغمہ خواں
دیکھئے کیا رنگ لائے تیری فطرت کی ضیا — جب تری آغوش میں خورشید ہو طلعت فشاں
اب بھی تیری ہر نظر ہے کامیابی کی کرن — اب بھی ہیں تیری جبیں میں صبحِ منزل کے نشاں
اِک تڑپ پیدا رہے پردوں میں تیرے ساز کے — گونجنے کو ہے تری آواز سے بزمِ جہاں

عظمتِ باقی تری مستحکم و پائندہ ہے
تیرا استقبل ستاروں کی طرح تابندہ ہے

شاعر کی تربت

جنگل بیاباں
ظلمت بداماں

شاعر کا مدفن
اُس میں فروزاں

پژمردہ اک پھول
اک شمع لرزاں

خاموش منزل
ماحول ویراں

ٹوٹا سا کتبہ
لیکن غزل خواں

پُر ہول منظر
لیکن نوا گر

اللہ اکبر!
اللہ اکبر!

کیا تازگی ہے
کیا دل کشی ہے

اک زندگی سی
چھائی ہوئی ہے

ہے خوابِ راحت
یا بے خودی ہے

یہ بے خودی بھی
بیدار سی ہے

مر کر ہو زندہ   شاعر وہی ہے

سنگِ لحد پر

تاروں کی چادر

راتیں منوّر   باتیں معطر

حسرت کے پیکاں   جذبِ رگِ جاں

نظروں میں اب تک   شبہائے ہجراں

سینے میں اب تک   روشن چراغاں

ہے بے کسی کا   عالم نمایاں

پھر بھی لحد ہے   فردوسِ خنداں

جلووں کا خرمن

جذبوں کا مخزن

یا بزمِ ایمن   شاعر کا مدفن!

الہام زادہ   ہے سر فتادہ

موجِ فنا سے   سرشارِ بادہ

فرصت ملی ہے   کل سے زیادہ

لکھّے کفن پر ہے یہ ارادہ
اک نظمِ رنگیں اک شعرِ سادہ
اک سطرِ عبرت
نقشِ حقیقت
لوحِ محبت شاعر کی تربت!

پھر اُٹھ کھڑا ہو شورش فزا ہو
تربت سے اپنی جلوہ نما ہو
دشت و چمن میں نغمہ سرا ہو
پھر تجھ سے دنیا درد آشنا ہو
پھر صورِ ہستی تیری نوا ہو
ہیں تیری خاطر
سُونے مناظر
جاگ اے مسافر! اُٹھ میرے شاعر!

حسن کا آخری حربہ

آہ، اے وعدہ خلاف، اے بے مروت، بے وفا
تو نے استغنا سے میرے دل کو برہم کر دیا

کیوں نہ ہو وحدت پرستیِ محبت کو ملال
میرے ہوتے ما سوا کا جب رہے تجھ کو خیال

محو ہیں تیرے تصور میں رہوں شام و سحر
اور میرے ذوقِ پیہم کی نہ ہو تجھ کو خبر

شام سے مجھ کو رہے خلوت میں تیرا انتظار
اور تو ہو بے وفا، مصروفِ سیرِ سبزہ زار

بے نیازی نے تری دل کو مرے تڑپا دیا
آتشِ پہلو کو دوزخ کی طرح بھڑکا دیا

میں ترا جاں سوختہ ہوں، مجھ سے بے پروا ہے تو
جانتا ہے خوب میرا دل تجھے جیسا ہے تو

عشق کی غیرت سے شاید تو ابھی واقف نہیں
جذبۂ نفرت سے تیری سادگی واقف نہیں

تیرے گلزارِ جمال و حسن کا گلچیں ہوں میں
تیرے پہلو کی، تری آغوش کی تزئیں ہوں میں

ہوں تری رنگیں اداؤں کے مزے لوٹے ہوئے
شوق کے شیشے لبوں پر ہیں ترے ٹوٹے ہوئے

کر چکا ہوں جذب تجھ کو اپنے دل کے جوش میں
مدتوں بے بس رہا ہے تو مری آغوش میں

اب بھی گر تجھ کو مری قدرِ وفاداری نہیں
صاف کہتا ہوں کہ جاں اپنی مجھے بھاری نہیں

دل جو استعفائے الفت کے لئے مجبور ہے
تجھ سے اب ترکِ تعلق مطلقاً منظور ہے

آہ، اے آرامِ دل اے غمگسارِ اضطراب!
یک بیک کیوں آگیا فطرت میں تیری انقلاب!

کیا ہوا، تر ہو گئی کیوں تیری چشمِ نازنیں
اللہ اللہ! حسن بھی مغموم ہوتا ہے کہیں!

آہ یہ اشکِ مسلسل، اور یہ زاری تری
پھر فریبِ لطف دیتی ہے نگوں ساری تری

تیرے اس احساس نے شکووں کا پہلو کھو دیا
تیرے اشکوں نے غبارِ دل کو یکسر دھو دیا

کیوں نصیبِ دشمناں ہوں تیری آنکھیں اشکبار
ایک آنسو پر ترے لاکھوں ستارے ہوں نثار

نرگسِ پُرنم نے تیری قلب کو لرزا دیا
شعلۂ غم پر مرے اک ابر سا برسا دیا

یہ تری افسردگی کیا قابلِ برداشت ہے؟
آخری حربہ ترا نا قابلِ برداشت ہے

آ، لبوں میں اپنے کر لوں جذب یہ موتی ترے
آہ یہ شبنم کے قطرے پھول پر ڈھلکے ہوئے!

آ میں آنکھیں اپنی تیری چشمِ پُرنم سے ملوں
آ میں اپنے شوق کے دامن سے آنسو پونچھ دوں

خوش ہو استعفائے الفت میں نے واپس لیلیا
خطبۂ ترکِ محبت، میں نے واپس لیلیا

آ پھر اپنے قول اور اقرار کی تجدید کر
مسکرا کر میری شامِ غم کو صبحِ عید کر

پھر وہی ہے تو وہی مجھ کو وفا سے کام ہے
تیرا ہر آنسو محبت کا نیا پیغام ہے

رات کو جب اضطراب دل سے گھبراتا ہوں میں
کنجِ خلوت چھوڑ کر تنہا نکل جاتا ہوں میں

ہُو کا اک عالم نظر آتا ہے ہر جانب مجھے
خوف سے لبریز سناٹے میں تھرّاتا ہوں میں

چاہتا ہوں کوئی تنہائی میں میرا ساتھ دے
وسعتِ عالم میں اپنا ذہن دوڑاتا ہوں میں

پھول خوابیدہ نظر آتے ہیں بُلبل پُرسکوت
جگنوؤں کو نیند کی آغوش میں پاتا ہوں میں

بزمِ حسن و ناز پر ہوتے ہیں گوناگوں حجاب
خوابگاہِ دوست تک جاتا ہوں لوٹ آتا ہوں میں

رحم کوئی میرے حالِ زار پر کھاتا نہیں
اور تاریکی میں لاکھوں ٹھوکریں کھاتا ہوں میں

کون اس تنہائی میں میرا شریکِ راہ ہو
بے محل آوارگی سے اپنی شرماتا ہوں میں
میں کبھی اک آہ بھر لیتا ہوں سینہ تھام کر
زیرِ لب نغمہ محبت کا کبھی گاتا ہوں میں
جب زمیں خالی سکوں سے مجھ کو آتی ہے نظر
جانبِ گردوں نگہ کی گود پھیلاتا ہوں میں
زرد رنگ اک دیدۂ بے خواب آتا ہے نظر
رات کی آغوش میں مہتاب آتا ہے نظر
منزلوں اس کی رفاقت میں گزر جاتا ہوں میں
یہ بھی میرے ساتھ جاتا ہے، جدھر جاتا ہوں میں
تیرتا ہے یہ بھی میرے ساتھ موجِ آب پر
جب لگی دل کی بجھانے نہر پر جاتا ہوں میں
روشنی اس کی بڑھا دیتی ہے محویت مری
جھولتا کرنوں میں تا حدِ نظر جاتا ہوں میں
نغمۂ خاموش اپنا یہ سناتا ہے مجھے

جب سر افگندہ بمیانِ رہگزر جاتا ہوں میں
دیکھتا ہوں اس کو اپنے سامنے ٹھہرا ہوا
شدّتِ واماندگی سے جب ٹھہر جاتا ہوں میں
دُور تک آئینہ بن جاتی ہے صحرا کی فضا
صورتِ دیوانہ حیرانِ نظر جاتا ہوں میں
یہ نہ ہو ہمراہ تو اک گام چلنا ہو محال
دل بر آتش، جاں بلب، سودا بسر جاتا ہوں میں
میرے اور اس کے سوا رہرو نہیں ہوتا کوئی
چلتے چلتے اپنے سائے سے بھی ڈر جاتا ہوں میں
یہ مجھے پہونچانے آتا ہے درِ کاشانہ تک
خلوتِ تاریک میں جب لوٹ کر جاتا ہوں میں

کیوں نہ شاکر ہو جنونِ ناتمامِ شب مرا
ہے رفیقِ بےکسی یہ ہم خرامِ شب مرا

شاعر کا نغمہ

(عالمِ ارواح سے)

اے جہانِ فانی کی، خاک چھاننے والو
اے فریبِ عشرت کو، عیش جاننے والو

اک پیامِ نَو لے کر میں بھی تم میں آیا تھا
اک صحیفۂ فطرت اپنے ساتھ لایا تھا

کوہ و دشت کو میں نے جب دیا پیام اپنا
سب نے مجھ کو پہونچایا عجز سے سلام اپنا

مختلف صداؤں سے لالہ زار میں گونجا
میں خزاں میں چلا آیا، میں بہار میں گونجا

سوز کر لیا حاصل میرے ساز سے سب نے
رس لیا مرے کیفِ دل نواز سے سب نے

وادیوں میں جا کر کی جب کبھی حدی خوانی
سنگلاخ راہوں کو میں نے کر دیا پانی

میں نے جب سمندر پر نغمہ اپنا برسایا
مطمئن ہوا طوفاں، موج نے سکوں پایا

میں نے چھو لیے پردے خلوتِ حقیقت کے
منکشف کیے اکثر رازِ بزمِ فطرت کے

حُسن و عشق کو میں نے زندگی عطا کر دی
شورشوں کو دنیا کی، خامشی عطا کر دی

مادّی فضاؤں سے دل مرا جو گھبرایا
ختم کر کے کام اپنا، میں یہاں چلا آیا

آج بھی مرے نغمے سوز و سازِ عالم ہیں
آج بھی مرے نالے دل گدازِ عالم ہیں

اب بھی میری رنگینی ہے چمن کے پھولوں میں
اب بھی ہے جنوں میرا دشت کے بگولوں میں

اب بھی گونج ہے میری کوہسار میں باقی
اب بھی ہے رجز میری کارزار میں باقی

اب بھی عشق کے دل میں میری آگ باقی ہے
اب بھی حُسن کے لب پر میرا راگ باقی ہے

برگ و بار پر طاری رنگِ فکر ہے میرا
محفلِ محبّت میں اب بھی ذکر ہے میرا

میرے مرنے جینے میں فرق ہے تو اتنا ہے
پہلے تھا میں دُنیا میں، آج مجھ میں دنیا ہے

پُر مرے تکلم سے زندگی کی راتیں ہیں
میرے شعرِ تر گویا میرے منھ کی باتیں ہیں

اپنے نورِ باطن سے شعلۂ جہندہ ہوں
میں یہاں بھی زندہ ہوں میں وُہاں بھی زندہ ہوں

نیستی و ہستی کا راز میں یہ سمجھا ہوں
خود ہی اپنی محفل تھا، خود ہی اپنا پردا ہوں

زندگی ہے بیداری، نیند ہے فنا میری
نام میرا باقی ہے، ہے یہی بقا میری

چراغِ ساحل

(اک چتا میں آگ کے شعلے فروزاں دیکھ کر)

ساحلِ بحر، درخشاں نظر آتا ہے مجھے — چند انگاروں میں طوفاں نظر آتا ہے مجھے

اک جہنم تپش افشاں ہے سرِ مرکزِ آب — ایک آتش کدہ لرزاں نظر آتا ہے مجھے

شامِ ساحل ہے کہ اک ماتمِ رنگینِ حیات — موجِ ہستی میں چراغاں نظر آتا ہے مجھے

سُرخ لہروں میں ہوا کی ہے تموّج پیدا — ایک ہنگامۂ سوزاں نظر آتا ہے مجھے

نیند طاری ہے تخیّل پہ شدید اور مہیب — موت کا خوابِ پریشاں نظر آتا ہے مجھے

جس کو فطرت نے کیا سوزِ حقیقت تفویض — اُس کا انجام فروزاں نظر آتا ہے مجھے

موت کی گود میں فرزندِ وطن ہے کوئی، — آگ کی سیج پہ انساں نظر آتا ہے مجھے

کیوں نہ ہو جائے پراگندہ دماغِ ساحل
خونِ تازہ سے ہے لبریز چراغِ ساحل

اسے دریا کے تلاطم نے بجھایا نہ کبھی — اسے ساحل کی ہواؤں نے اڑایا نہ کبھی

بجھ کے پھر شمع جلی، ڈوب کے تارے نکلے — اس کی فطرت میں تغیر مگر آیا نہ کبھی

دل پسیجا نہ کسی کا بھی دہوئیں سے اس کے — دامنِ موج نے سینے سے لگایا نہ کبھی

ابر نے بھی کبھی بوچھار سے ٹھنڈا نہ کیا — آندھیوں نے اسے جلنے سے بچایا نہ کبھی

درد پیدا نہ ہوا اس کا کسی کے دل میں — اس کے شعلوں کو محبت نے دبایا نہ کبھی

صبح کو اس پہ نوازش نہ ہوئی شبنم کی — رات کو خاک سے تاروں نے اٹھایا نہ کبھی

اپنی موجوں میں کیا بادِ فنا نے تحلیل — گرمیٔ بزمِ جہاں اس کو بنایا نہ کبھی

راکھ باقی ہے نہ شعلوں کی دوش باقی ہے
دلِ شاعر میں مگر اس کی تپش باقی ہے

شامِ لحد

اپنی حد پر بھی نہیں ملتا نشانِ زندگی   گر پڑا تھک کر کہاں لے کاروانِ زندگی
بے گل و بے شمع بھی انساں جی سکتا ہی کیا   غالباً ہُو کا مکاں ہے خاکدانِ زندگی
چلتے چلتے راستے میں ہو گئی ہو جس کو شام   وہ مسافر ہے اسیرِ امتحانِ زندگی

دفعتاً اس کا اُلٹ جانا بہت آسان ہے
موت کی چند انگلیوں پر زیست کا میدان ہے

مستقل اک نیند ہے مقسومِ دنیائے نیاز   مائلِ رم، غزنوی سے اب نہیں زلفِ ایاز
عمر بھر کرتا رہا تحقیقِ اسرارِ حیات   قبر میں آ کر کھلا، میں ہی تو تھا ہستی کا راز
شام ہے، روشن کرو شمعِ حرم سے گھر مرا   حسبِ عادت روشنی میں مجھ کو پڑھنی ہے نماز

میری آنکھوں کو تمنائے تماشا ہے ہنوز
لاؤ تارے میری راتوں کے، اندھیرا ہے ہنوز

خامشی، وہ بھی بھیانک، تیرگی، وہ بھی اُداس   یہ مآلِ زندگی یارب مجھے آیا نہ راس
صبح کی تخلیق کر میری شبِ تاریک میں   یوں سرابِ نور کا کب تک کفن میں انعکاس

ایک سناٹا، بلا انگیز تا حدِ نظر دور تک گھیرے ہوئے ہنگامۂ خوف و ہراس

گردشِ ایام کیوں مجھ تک گزر کرتی نہیں؟
زندگی کیوں رُخ کبھی اپنا ادھر کرتی نہیں؟

استخوان و گوشت کا اک مزبلہ خوار و ذلیل! اُس پہ تاریکی مسلط، یا جلیلُ، یا جمیل!
اب کہاں وہ شورشِ نظّارۂ حسن و جمال اب کہاں وہ پائے آوارہ میں شورِ الرحیل
بھول جائے زندگی ہستی کو میری بھول جا گو نہ ہونا ہی مرا ہے میرے ہونے کی دلیل

صبح کی اُمید آسودہ کُنِ جذبات ہے
عالمِ فرصت نشینی کی یہ پہلی رات ہے

دل مرا وحشی نہیں احساس دیوانہ نہیں غیر معمولی یہ ایسا کوئی افسانہ نہیں
زندگی میں لاکھ بار اس پر اُٹھایا ہے قلم راز سے اس کے مری تخئیل بیگانہ نہیں
صبحِ ہستی کے لئے تھی ناگزیر اک شام بھی شاہکارِ نظمِ فطرت ہے، یہ ویرانہ نہیں

پھر فروغِ نیستی سے ہستیاں بن جائیں گی
تربتیں کروٹ بدل کر بستیاں بن جائیں گی

دُعائے نیم شبی

وبالِ زلیت ہے دردِ نہاں کی بے سببی
رہینِ دستِ دعا ہے مری سکوں طلبی

شرابِ حُسن و لبِ دوست، اے جزاک اللہ!
عجیب حیینہ ہے میرا مذاقِ تشنہ لبی

بجھے جو آگ نہ دل کی تو کیا علاج اس کا
نگاہِ مست سے پی کر فسردہ عقبی

کسی سے فطرتِ غمِ دوست، کیف گیر نہیں
ترانۂ عجمی ہو کہ نغمۂ عربی

تپیدہ دل تپش اندوز، بے قرار ہوں میں
مزاج برق ہوں سیماب ہوں شرار ہوں میں

الٰہی سوزِ درون کو شگفتہ کاری دے
غمِ نہفتہ سے فطرت کو رستگاری دے

یہ اضطراب مٹا دے مری طبیعت کا
حیاتِ عشق کو پیغامِ خوشگواری دے

ضیائے شمع ہو تسکینِ روحِ پروانہ
وفائے حسن و محبت کو استواری دے

جو بیقرار ہی رکھنا ہے پچھلی راتوں میں
تو حسن کو بھی مرے ساتھ بے قراری دے

دلِ قرار طلب کامیاب ہو جائے
دعائے نیم شبی مستجاب ہو جائے

ارضِ تاج

ارضِ تاج

اے مسافر آ مری ویراں سرا کی سیر کر
پردہ ہائے خاک پر ماہ و سُہا کی سیر کر

ریت کے ٹیلے پر آ کر بے تکلف بیٹھ جا
اور اک اُجڑی ہوئی بزمِ وفا کی سیر کر

شوخیٔ عنوانِ افسانہ ہے مستورِ حجاب
ابتدا پر غور فرما انتہا کی سیر کر

ڈھونڈ گردِ راہ میں میرے وطن کی عظمتیں
سوزِ خاکستر میں انوارِ ضیا کی سیر کر

میر و غالب کے ہیولے جس کی مٹّی سے بنے
اُس زمیں، اُس خاکدانِ ارتقا کی سیر کر

دیکھ جمنا لے رہی ہے کسل سے انگڑائیاں
اِس کی موجوں میں سرابِ غمِ فزا کی سیر کر

بھیج پروانوں کی خاکستر پہ رحمت اور سلام
محفلِ رفتہ کے آثارِ فنا کی سیر کر

سینۂ گُل چاک ہے، غنچے کے دل میں تیر ہے
کیا بھیانک ایک رنگیں خواب کی تعبیر ہے!

زیرِ دامانِ افق دھندلے سے کچھ انوار دیکھ
زندگی کی وسعتوں میں موت کے آثار دیکھ

دیکھ میرے شبنمستاں کا مآلِ تازگی
خشک ہو کر پھول بن جاتے ہیں کیونکر خار دیکھ

دیکھ دل کی آنکھ سے قصرِ شہی کی رفعتیں
یہ شکستہ بام، وہ ٹوٹی ہوئی دیوار دیکھ

دیکھ وہ ہے سامنے اک گنبدِ مینو سواد
وہ نظر آتا ہے ویرانے میں اک مینار دیکھ

دیکھ، مغرب کی طرف سورج کی زرّیں خوابگاہ
جانبِ مشرق مجسّم اک سحر، بیدار دیکھ

دیکھ امواج ہوا میں تیر ہیں پرّاں ہنوز
ہے فضائے خونچکاں پر رقص میں تلوار دیکھ

دیکھ، قلعے کی فصیلِ سرخ و رنگِ انقلاب
اور محلوں کے محل پر خاک کے انبار دیکھ

منظرِ تاراجیٔ باغ و بہارِ ریاست ایں
عبرتِ نظّارہ، تصویرِ دیارِ ریاست ایں

اے مسافر سخت نکلا ہفت خوانِ زندگی
رک گیا منزل سے پہلے کاروانِ زندگی

موت ظلمت بن کے چھائی ہے جس ارضِ پاک پر
ذرّہ ذرّہ اس کا دیتا ہے نشانِ زندگی

داغ شگفتِ گل، خزاں کی ایک روداد حزیں
خامشی ہر خار کی اک داستانِ زندگی

ہم جنھیں سمجھے ہوئے تھے زندگی کا گلستاں
خود انھیں پھولوں نے لوٹا گلستانِ زندگی

پائے جاتے ہیں ستارے اب تک اس کی خاک میں
یہ زمیں بھی ایک دن تھی آسمانِ زندگی

کل جن ایواں میں چھلکتے تھے مئے عشرت کے جام
آج ہر پتھر ہے اس کا نوحہ خوانِ زندگی

دیکھتا ہے تو جسے ویران کل تھا یہ دیار
عظمتوں کی ایک دنیا، اک جہانِ زندگی

ذرّہ ذرّہ جو غمِ ایام سے تفتیدہ ہے
اس کی ہر کروٹ میں اک خورشیدِ نو پوشیدہ ہے

آ مسافر، کچھ مناظر بھی دکھاؤں میں تجھے
گوشے گوشے میں وطن کے لیکے جاؤں میں تجھے

اخذ کی جاتی ہے ظاہر سے حقیقت کس طرح
سیر کرنا بزمِ عبرت کی سکھاؤں میں تجھے

تیری آنکھوں میں تماشائے غم و حسرت کروں
آئینہ احساس کا اپنے بناؤں میں تجھے

خشک ہونٹوں سے، نگاہوں سے، زبانِ تشنہ سے
نوحۂ بربادیٔ محفل سناؤں میں تجھے

سینۂ ہر ذرہ سے نشتر کدہ پیدا کروں
خود بھی رو دوں اور رو رو کر رلاؤں میں تجھے

دل ہے یا پتھر ترے سینے میں، اندازہ کروں
اک فغانِ زیرِ لب سے آزماؤں میں تجھے

جب تو مضطر ہو، تو دوں سرمایۂ تسکین تو
زخم خوردہ اپنے سینے سے لگاؤں میں تجھے

میں کہ اک باقی حدیثِ گلشن تاراج ہوں
ترجمانِ وارداتِ بزمِ دوشیں آج ہوں

تاج محل

آ تجھے میں اپنے فردوسِ وطن میں لے چلوں
جس میں حوریں باغباں ہیں، اس چمن میں لے چلوں

اک مکمل آئینہ خانہ دکھاؤں میں تجھے
اک مجسم رنگ و بو کی انجمن میں لے چلوں

باغچہ یہ وہ نہیں جو ملک تھا شدّاد کی
جو ہے جنت قدسیوں کی اس عدن میں لے چلوں

جلوہ گاہِ لالۂ و گُل کی میں دعوت دوں تجھے
صحنِ زارِ نسترین و نسترن میں لے چلوں

آ دکھاؤں وہ مرقع جس پہ تو مر کر کہے
اس کی اک تصویر پوشیدہ کفن میں لے چلوں

زندگی کی جس کے گوشوں سے اُبلتی ہے شراب
جو ابھی اب بھی ہے اُس بزمِ کہن میں لے چلوں

دعوتِ صد کیف دوں میں روحِ تشنہ کو تری
نور کے تڑکے ستاروں کی بھرن میں لے چلوں

لے یہ نقشِ سادۂ خاکسترِ برباد دیکھ
آنکھ بن کر دُرّۃُ التاجِ خراب آباد دیکھ

پُرسکوں حُسن و محبت کا یہ اک طوفان دیکھ
جس کے حُسن و عشق دو عنواں ہیں وہ رُمان دیکھ

یہ مصوّر کا تخیُّل اور خوابِ مرمریں
روح میں ہوتا ہے جس کو دیکھ کر ہیجان دیکھ

دیکھ اس کے فرش پر ہیں عرش کتنے جلوہ گر
دیکھ اک افسانۂ ممتاز کا عنوان دیکھ

سبزہ در سبزہ، گُل اندر گُل، بہار اندر بہار
کر نظر ماحول پر اس کے پھر اس کی شان دیکھ

دیکھ وقتِ صبح اس میں جلوۂ ماہِ تمام
شام کو اس کی تجلّی کے نئے سامان دیکھ

تکملہ صنعت کا ہے اس کا ہر اک نقش و نگار
آگیا ہے کھنچ کے اک نقطے میں ہندستان دیکھ

اس کی بالیں پر نظر آتا ہے قلعہ جلوہ بار
اور جمنا کر رہی ہے پائینتی اشنان دیکھ

کیا متاعِ دو جہاں سے یہ گراں قیمت نہیں؟
پوچھتا ہوں میں کہ یہ کیا ہے اگر جنت نہیں؟

یہ بظاہر اک گورستانِ خوش انداز ہے
مرقدِ شاہ جہاں و مدفنِ ممتاز ہے

اس سے عبرت کی جگہ لیکن ہے عشرت آشکار
دل یہاں آ کر بہل جاتا ہے یہ کیا راز ہے؟

"قلبِ شاعر" پر حقیقت ہو چکی ہے منکشف
"ذہنِ شاعر" خلوتِ اسرار کا غماز ہے

فی الحقیقت "تاج" ہے آرام گاہِ حسن و عشق
مشرقِ شوق و نیاز و جلوہ گاہِ ناز ہے

ہے محبت، اک شگفتہ اس کی تعمیری اساس
زندگی یوں نقشِ عبرت پر اثر انداز ہے

بھول جاتا ہے یہاں انسان اپنے رنج و غم
روح کے نغمے ہیں جس میں جذبہ وہ ساز ہے

خوبصورت اک اضافہ بزمِ فطرت میں ہے "تاج"
جو حقیقت کی فضا میں مائلِ پرواز ہے

ہے جو گھر صاحبقراں کے جلوۂ مستور کا
عکس ہے شاید یہ اُس جنت کے قصرِ نور کا

ہمتِ مسلم اگر ایسے بنا لے چند گھر
موت کے در بند ہو جائیں حریمِ ہند پر

آہ لیکن دل میں جب نورِ محبت ہی نہ ہو
ظلمتِ ہستی میں کیا پیدا ہوں آثارِ سحر

کاش دنیا اور اک شاہ جہاں پیدا کرے
کاش پھر ہو خاک سے جسمِ محبت جلوہ گر

دیدۂ سیاح میں گر ہو بصیرت کی چمک
اب بھی سورج دیکھ لے ذروں کے سینے چیر کر

یہ بہارِ ظاہری یہ اک نشاطِ آشکار
جو بہر عنوان ہے حیرت فزائے ہر نظر

اس کا باطن ہے کچھ اس سے بھی زیادہ روح کش
کس نے دیکھے ہیں ابھی وہ جلوہ ہائے مستتر

جب محبت غور سے اس پر کرے گی تبصرہ
روح کے پردے نظر آئیں گے یہ بام اور در

عشق اس محفل میں ہے صد نالۂ صد کاوش ہنوز
حُسن ہے ان چلمنوں میں محوِ آرائش ہنوز

قلعۂ معلّٰی

دیکھ یہ ایوانِ شاہی، یہ حریمِ سروری
کل یہاں چھائی ہوئی تھی سطوتِ اسکندری

اس پہ صدیوں پرچمِ اسلام لہراتا رہا
جس کی موجیں چھو لیا کرتی تھیں چترِ چنبری

دیکھ یہ شاہی محل، نظارہ خیز و کیف ریز
جن کے در پر آسماں تھا، پردۂ نیلوفری

دیکھ یہ مسجد، جسے ڈھالا تھا موتی کوٹ کر
یہ مجسّم چاندنی، یہ مطلقاً جلوہ گری

دیکھ یہ مندرِ مساوات و رواداری کے نقش
اور یہ دربارِ خاص و عام کی گردوں سری

سوختہ ساماں ہے اب یہ خرمنِ جاہ و جلال
لُٹ گئی وہ محفلِ دوشینِ عہدِ اکبری

ایک افسانہ ہے خوں آغشتۂ صد انقلاب
شوکتِ شاہ جہان و اقتدارِ بابری

سُرخ تعمیر اس کی لالے کا فسردہ باغ ہے
دامنِ ہستی پہ سوکھا سا لہو کا داغ ہے

اے مسافر آ، دُعا مانگیں کہ اوجِ کامیاب
اس کے ہر گوشے سے پیدا ہو برنگِ آفتاب

اکبر و شاہِ جہاں کو قلعہ پھر آواز دے — جو یہاں سے صرف تھوڑی دور ہیں مصروفِ خواب
محشرِ رنگ و نوا سے پھر ہو زندہ خامشی، — سازِ کُہنہ سے ہو پیدا نغمۂ چنگ و رباب
پھر ہو آثارِ شکستہ سے نمودِ یک جہاں — جلوہ گر پھر ہو جوانی بے حجاب و بے نقاب
پھر بنے خاکسترِ محفل سے اک دُنیائے نَو — جاہ و صولت ہم نفس، اقبال و دولت ہمرکاب
آہ، یہ دولت سرا، یہ بارگاہِ رنگ و بو — اس خراب آباد میں اس طرح ہو جائیں خراب!
ہوں حریمِ شاہ میں مسند نشیں بربادیاں — انقلاب اے انقلاب اے انقلاب انقلاب!

بھیج یا رب زینتیں ان شہ نشینوں کے لئے
یہ مکاں ترسا کریں کب تک مکینوں کے لئے؟

مسجدِ جامع

دیکھ یہ اسلافِ مُسلم کا عبادت خانہ ہے — فرقِ شاہی جس میں جھکتا تھا، یہ وہ کاشانہ ہے
رفعتِ اسلام تھی رفعت سے اس کی آشکار — آہ، وہ رفعت جو اک بھولا ہوا افسانہ ہے
دیکھ ہر پتھر میں ہے اک جلوۂ سنگِ حرم — اور انگڑائی ہر اک محراب کی مستانہ ہے
خامشی میں خطبۂ شاہنشہی کی گونج سُن — گو فضا، اس دور کی آواز سے بیگانہ ہے
وسعتوں میں اس کی کل سجدوں کی گنجائش نہ تھی — آج اک گوشے پہ قانع ہمتِ مردانہ ہے

وقتِ مغرب سیکڑوں فانوس جلتے تھے جہاں
اب وہاں اک شمع تسکینِ دلِ پروانہ ہے

آہ یہ مینار دگنبد کی نمود اس دور میں
گردشِ ایام کی تسبیح کا اک دانہ ہے

ملتِ مرحوم کی تصویرِ روحانی ہے یہ
عظمتِ اسلام کا اک نقشِ لافانی ہے یہ

اِعتمادُ الدّولہ

الغیاث، اے انقلابِ دورِ گردوں، الاماں!
یہ تری ناقابلِ برداشت چیرہ دستیاں!

کر دیے برباد گلہائے شگفتہ کس قدر
کس قدر مرجھائیں کلیاں نوبہارِ نوجواں

اے مسافر ہے ابھی تیری نظر مصروفِ سیر
اور میرا طائرِ دل آشیاں در آشیاں

بڑھ ذرا آگے، ٹھہر، لے آگیا وہ بھی مقام
دفن ہے ایران کا سرمایۂ عظمت جہاں

وہ بھی اک تجھ سا مسافر اک غریبِ بے وطن
کاروانِ بے کسی کا اک امیرِ کارواں

آکے لی اس سرزمیں میں اسکی قسمت نے پناہ
مرحمت کی اُس کو فطرت نے حیاتِ جاوداں

وہ امانت دار تھا اُس گوہرِ شہوار کا
جس کے مستقبل میں ماضی کی تلافی تھی نہاں

خانہ بربادی و ویرانی کا مقصد ایک تھا
ابتدا گو تھی بُری، انجام لیکن نیک تھا

دیکھ اس تعمیرِ روشن کی درخشانی بھی دیکھ — اس تجلّی گاہ کے آثارِ کیوانی بھی دیکھ

اب بھی مطلق شاعری ہیں اسکے لافانی نقوش — ان میں سنگینی و رنگینی کی ارزانی بھی دیکھ

طرزِ تعمیر آج تک اس کی ہے فردوسِ نگاہ — پارہ ہائے سنگ کی اثرنگ سامانی بھی دیکھ

اک فرشتہ ہے کھڑا اوڑھے ہوئے رنگیں ردا — خامشی بھی دیکھ اس کی اور حیرانی بھی دیکھ

وجد میں آتا ہے دل یہ نقشِ عظمت دیکھ کر — مادّی ترکیب کا یہ قصرِ روحانی بھی دیکھ

تو نے تصویریں بہت برباد دیکھی ہیں، مگر — اک مُرقّع یادگارِ محفلِ فانی بھی دیکھ

تو نے اس ماحول میں چڑیوں کے نغمے سُن لئے — اب ذرا میرے تخیّل کی پرافشانی بھی دیکھ

میری نظروں میں وہی طوفان لرزاں ہے ہنوز
سندھ کے جنگل میں نظارہ پریشاں ہے ہنوز

وہ اندھیری رات وہ طوفان ابر و باد کا — وہ مجسّم درد بن جانا دلِ ناشاد کا

جب سمٹ کر بن گئی تھی خوف ساری کائنات — تھا ہر اک لمحہ قیامت عالمِ ایجاد کا

وہ کھُلا میدان، وہ آندھی، وہ بے سامانیاں — ضبط کا موقع، نہ موقع نالہ و فریاد کا

کلکِ قدرت صرف تھی تقدیر کی تجدید میں — اور ہی کچھ تھا ارادہ فطرتِ آزاد کا

رات کے پردے سے نکلا نیّرِ تابانِ صبح — شور اُٹھا بزمِ امکاں میں مبارکباد کا

کاروانِ خستہ پا آسودۂ منزل ہوا — بزمِ فطرت میں عروجِ انجام ہے افتاد کا

عیشِ منزل، کیفِ منزل، نورِ منزل کچھ نہ پوچھ
تھی جہاں گیری" صلہ اک مورد بیداد کا

جن کا ہمسر صفحۂ تاریخ پر نایاب ہے
یہ اُنھیں نام آوروں کی ایک بزمِ خواب ہے

شام کو جس وقت رخصت ہو رہا ہو آفتاب
اور ہو ہر موج میں دریا کی پیدا انقلاب

دست بر دل بیٹھ جا اس خوابگہ کے سامنے
غور سے پھر دیکھ اس کی ہر ادائے کامیاب

یہ در و دیوار پر رنگین تاروں کا ہجوم
یہ جمالِ مرمریں جیسے فرشتوں کا شباب

زیرِ ساحل تھرتھراتا ہے چراغانِ بہار
عکس اس کا جب کبھی کرتا ہے عزمِ پاتراب

انعکاسِ سنگ میں، امواج پر مینا گری
امتزاجِ رنگ میں، آمیزشِ برق و سحاب

اس کے جلووں سے ملا کرتا ہے موجوں کو قرار
دیکھنے اس کو ٹھہر جاتے ہیں دریا میں حباب

یوں ہے اک نقشِ مجسّم نور ریز و کیف خیز
اک دُلہن ہو جیسے چندے آب چندے ماہتاب

گو سراپا خامشی ہے گو سراپا سوز ہے
پھر بھی یہ اس محفلِ مرحوم کا نوروز ہے

عطر سا برسا ہوا ہے اس کی لوحِ نور پر
گلکدہ جیسے بنایا ہو کسی نے طور پر

اک ستارہ سا ہو لرزاں طشتِ زنگار رنگ میں
شمع سی رکھّی ہوئی ہے دستِ نازِ حور پر

ہو گیا ہے مرتسم اوراقِ گُل پر رنگِ صبح
موجِ مے گویا ہے رقصاں ساغرِ بلّور پر

یوں بلندی پر چمکتے ہیں نقوشِ منحنی　　جیسے پروانے تڑپتے ہوں چراغِ دور پر
عبرت انگیز و نظر افروز، شفاف و جمیل　　نور کے پردے پڑے ہیں جلوۂ مستور پر
سنگِ ابیض پر بنے ہیں اس ادا سے سرخ پھول　　لعل گویا جڑ دئے ہیں تختۂ کافور پر
اس کے رنگ و آب میں ممزوج ہیں تابانیاں　　چاندنی چھٹکی ہے یا افشردۂ انگور پر

فطرتاً ترجیح ہے تخئیلِ مانی پر اسے
ناز ہے اپنی حیاتِ جاودانی پر اسے

چینی کا روضہ

ذہنِ صنعت کی ذرا یہ دیکھ صنعت کاریاں　　ہو رہی ہیں خاک کے انبار پر دُرباریاں
اس کا رنگِ ابتدائی کیا سمجھ سکتا ہے تو؟　　اور پڑھ سکتا ہے کیا یہ ہلکی ہلکی دھاریاں؟
جانتا ہے تو برس جاتی تھیں کتنی نزہتیں　　اس پہ رنگ و نور کی چلتی تھیں جب پچکاریاں
اس کے دامن پر فروزاں تھے ہزاروں سرخ پھول　　جیسے پھیلا دی ہوں ساحل پر گلابی ساریاں
اب یہ اینٹوں پتھروں کا ایک فانی ڈھیر ہے　　کر رہی ہیں حسرتیں بیٹھی ہوئی غم خواریاں
شاعرِ شیراز ہے آسودۂ خوابِ گراں　　تھک تھکا کر سو گئی ہیں فکر کی بیداریاں
اب ہے سناٹا یہاں پر موت کا چھایا ہوا　　انقلابِ دہر کی دیکھ آدمی آزاریاں

وہ تقدس ہے نہ اب وہ شوکتِ ممتاز ہے

صرف اہلِ شہر ہیں اور دعوتِ شیراز ہے

دیکھ اس شاعر کا میں تجھ کو بتاؤں اک گناہ
ہو گیا جس سے وقارِ شہرت و عظمت تباہ

ڈھیر پر مٹی کے سیروں اس نے چھینی تھوپ لی
ہے مگر اک گوشۂ تاریک اس کی خوابگاہ

کاش یہ تعمیر کرتا اپنے قصرِ فکر کی
کاش یہ اک شعر کہتا بے نظیر و بے پناہ

کاش یہ اک نظم کہتا بے مثال و لازوال
کاش ہوتی دُور رس اور دُور بیں اسکی نگاہ

آج اس کے نام سے آگاہ ہے دنیا میں کون؟
ٹین کا بے رنگ ٹکڑا اور دیوارِ سیاہ!

شاعرِ شیراز! آ کر ہند میں تو مر گیا
یہ تری گمنامیاں ہیں موت پر تیری گواہ

عہدِ شاہی میں جو تو دیوال ہوا تو کیا ہوا
اک ترا دیوان ہوتا زندگی کی شمعِ راہ

تیرا فن اطلاق تیرے حال پر کرتا نہیں

مر گیا تو کیوں کہ شاعر تو کبھی مرتا نہیں؟

آرام باغ

یہ تفرج گاہ، یہ ہمسایۂ خُلدِ بریں
گُل بداماں گُل فشاں گل ریز گلشن آفریں

اس کی شادابی سے قائم تھی بہارِ کائنات
سبزہ تھا ہمراز اس کا اور دریا ہم نشیں

اب بھی اس کے پاؤں چھو لیتی ہیں موجیں بار بار
اس کی بربادی میں گو ذوقِ پذیرائی نہیں

روح کو بالیدگی ملتی تھی اس کی سیر سے
عیش مندوں کے لئے تھا یہ مقامِ بہتریں

پرورش پاتی تھی اس کے سایے میں روحِ بہار
شام تھی اس کی حنا زار اور صبح اس کی یاسمیں

ہاں یہ ہے دیکھے ہوئے گلگشتِ انداز و جمال
ثبت ہے اس پر حسینوں کا خرامِ نازنیں

جس کو بوسے دے رہا تھا پرچمِ جاہ و جلال
سبزۂ پامال ہے آج اس کی وہ روشن جبیں

سرو ہے افسردہ خاطر، پا بگِل شمشاد ہے
لیکن اس کو اب بھی اپنا خوابِ رنگیں یاد ہے

دیکھ وہ شہزادیاں پھرتی ہیں اٹھلاتی ہوئی
ہر روش پر انکھڑیوں سے پھول برساتی ہوئی

تازہ کلیاں توڑ کر دوڑی وہ اک کمسن کنیز
نکلی کنجِ گل سے وہ اک خادمہ گاتی ہوئی

نذر لے کر تازہ پھولوں کی چلی بادِ نسیم
وہ ہوا آئی دماغ و دل کو مہکاتی ہوئی

وہ پپیہے کی صدائیں۔ وہ نوا طاؤس کی
زندگی کی آگ سے سینوں کو گرماتی ہوئی

وہ ہوا شہزادۂ بزمِ رنگ و بو میں باریاب
وہ چھپی کوئی لجاتی اور شرماتی ہوئی

آج اس فردوس میں باقی کہاں وہ زندگی
آج پھرتی ہیں بہاریں ٹھوکریں کھاتی ہوئی

سب جسے رسماً کہا کرتے ہیں اب "آرام باغ"
اس نے دیکھی ہیں ہماری عظمتیں جاتی ہوئی

انقلابِ رفتہ سے لالے کا دل پُر داغ ہے
ہے بہاروں کا یہ رنگیں مقبرہ یا باغ ہے

جمنا

دیکھ یہ کون آ رہا ہے پردۂ اسرار سے؟   کیا ترشح ہو رہا ہے گرمیٔ رفتار سے؟

آہ، یہ بنتِ ہمالہ، مادرِ ہندوستاں   دودھ پیتی ہے زمیں جس کی مقدس دھار سے

آج بے کیفی سی ہے اس کے خرامِ ناز میں   یہ کبھی کیف آشنا تھی جذبۂ سرشار سے

دَورِ ماضی میں نہ تھیں محدود اس کی وسعتیں   رات دن یہ کھیلتی تھی قلعے کی دیوار سے

جلوۂ اقبال کا آئینہ تھا اس کا جمال   تھی نمودِ خلد ہر اندازِ کوثر بار سے

جگمگا اُٹھتے تھے زندہ دیویوں سے اس کے گھاٹ   حُسن اس پر کوندتا تھا صبح کے آثار سے

اس کے سینے پر زمیں کی طرح اب چلتے ہیں ہل   اب شرار اُٹھتے ہیں اس کی سطحِ ناہموار سے

جستجوئے منزلِ گم گشتہ میں بیتاب ہیں
اب یہ موجیں گریۂ عبرت کا اک سیلاب ہیں

سکندرہ

سر جھکا اے زندہ دل سیاح، نیچی کر نگاہ   سامنے ہے بارگاہِ خسروِ کیواں پناہ

یہ مجسّم نور، یکسر صبح، مطلق آئینہ   جس کے پرتو سے نکل جاتے ہیں بچ کر مہر و ماہ

دن ڈھلے، راتیں ڈھلیں، آئے ہزاروں انقلاب
اپنے مرکز پر یونہی قائم ہے یہ تصویرِ جاہ

دیکھ اس تعمیر پر اب تک برستا ہے جلال
کانپتی ہے جب نظر پڑھتی ہے سوئے خوابگاہ

کچھ نقوش اس طرح کندہ ہیں در و دیوار پر
جیسے ہیں محفوظ اب تک افسر و تاج و کلاہ

ہے یہ خلوت اُس کی جس کے پنجۂ تدبیر نے
ایک رستہ کر دیا از بُت کدہ تا خانقاہ

یہ امینِ سطوتِ مرحومِ ارضِ ہند ہے
کر نہیں سکتی اسے گردش زمانے کی تباہ

جب اِدھر آئے گی خودداری کا سر جھک جائیگا
جب اِدھر نکلے گا استبداد، ٹھوکر کھائیگا

عالمِ ایجاد کوئی آئینا پیدا کرے
اُس میں اس تصویرِ عظمت سے جِلا پیدا کرے

پھر اُسے رکھے زمانے کی نظر کے سامنے
قلب میں جو ہر غمِ اسلاف کا پیدا کرے

خفتگانِ خاک کو پھر دے نویدِ زندگی
انحطاط اے کاش رنگِ ارتقا پیدا کرے

مقبرے بن جائیں اِس دُنیا کے ایوانِ حیات
انقلابِ نو کوئی ایسا خُدا پیدا کرے

ہو خطیبِ زندگی پھر خطبہ خواں مینار پر
خامشی میں سازِ فطرت پھر نوا پیدا کرے

بام و در سے پھوٹ نکلے چشمۂ آبِ حیات
یہ ضیائے مرمریں نورِ بقا پیدا کرے

موت کی ہیبت سے جس نے کر دیا تھا بے نیاز
کیا عجب وہ روح پھر بزمِ فنا پیدا کرے

عظمتوں کی اک امانت خاک کے سینے میں ہے
اک جہانِ سطوتِ رفتہ اس آئینے میں ہے

فتح پور سیکری

دیکھ ادب سے دیکھ، یہ نقشِ عقیدت کا اُبھار
"موت کی وادی" نے پائی تھی حیاتِ مستعار

سن گرج توپوں کی اور جھنکار تلواروں کی سن
دیکھ وہ برپا ہے زیرِ کوہ، شورِ کارزار

اس زمیں پر بھی کبھی برسا ہے، انسانی لہو
خونِ مسلم سے بنا ہے یہ خرابہ لالہ زار

عبرتِ تاریخ کچھ بکھرے ہوئے آثار ہیں
ہیں امانت عہدِ رفتہ کی شکستہ کچھ مزار

دیکھ یہ شاہی مکانوں کا ہے اک انبارِ سُرخ
رہ گیا ہو جس طرح گھٹ کر کہیں رنگیں غبار

تھا تصرّف یہ بھی اک گوشہ نشیں درویش کا
پھوٹ نکلی سینۂ کہسار سے موجِ بہار

یہ مکاں، یہ قصر، یہ حمّام یہ مینار و در
اب بھی ہیں شان و شکوہِ اکبری کی یادگار

خامشی میں زندگی کی بو کہیں باقی نہیں
ہیں مکاں باقی مگر ان کے مکیں باقی نہیں

غسل کو بھرتے تھے جن حوضوں میں کل عطرِ گلاب
بھیڑیوں اور گیدڑوں کا آج وہ ہیں فرشِ خواب

جن میں ہوتی تھیں فروکش، رانیاں، شہزادیاں
وہ محل چمگادڑوں کی گردشوں سے ہیں خراب

جن میں کل تک تھے ابوالفضل اور فیضی فیض بار
آج اُن کاشانوں میں ویرانیاں ہیں باریاب

زندگی تھی ذرے ذرے میں یہاں آئینہ دار
دیکھنے والے ابھی باقی ہیں ماہ و آفتاب

اب یہ محفل اک شکستہ ساغرِ بے بادہ ہے
جیسے لٹ کر رہ گئی ہو کائناتِ رنگ و آب

جانے والے کیوں نہ اپنے ساتھ ان کو لے گئے
آہ یہ آثارِ عظمت یوں اسیرِ انقلاب!

"پردہ داری می کند بر طاقِ کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب"

محو کن ذوقِ نظر را در تماشائے دگر
تا برآید از ہمیں ویرانہ دنیائے دگر

مولدِ غالب

اے مسافر تو نے دیکھے قصر و ایوان و مزار
جھونپڑا بھی دیکھ اک شاعر کا ہو کر اشکبار

آگرے کی خاک سے سورج ہوا تھا اک طلوع
ضو فگن، ضو ریز، جلوہ آفریں و جلوہ بار

جانبِ دہلی فضائے آگرہ سے کھینچ کر
لے گیا ساتھ اُس کو دار السلطنت کا اقتدار

ہر طرف ہے گونج اس کے نغمۂ الہام کی
سرزمینِ ہند ہے اُس کی نوا سے نغمہ زار

ہے یہ مولد اُس کا، جو ہے زندۂ جاوید آج
اس کی ویرانی میں ہے تخئیلِ شاعر کا نکھار

زندگی میں اپنی اس انجام سے واقف تھا وہ
اُس کا یہ اک شعر مستقبل کا تھا آئینہ دار

"اُگ رہا ہے سبزہ لے غالب در و دیوار سے
ہم بیاباں میں ہیں آئی ہے ہمارے گھر بہار"

قطرے نے نشو و نما دی قلزمِ موّاج کو
نازشیں ہیں مولدِ غالب پہ "ارضِ تاج" کو

شامِ حال

اے مسافر تھک گیا، اب فرصتِ آرام ہے
حال و ماضی پر مگر تنقید کا ہنگام ہے

ذرّے ذرّے کی زباں ہو وقفِ شرحِ رفت و بود
دیکھ کیسی ابتدا تھی اور کیا انجام ہے؟

گر زمیں سے چھین لے فطرت یہ آثارِ قدیم
اکبرآباد آج اک بازیچۂ ایام ہے

چلتی پھرتی چند لاشیں ہیں یہ اربابِ وطن
موت بن کر آن پہنچی ہے؟ ہماری زندگی کی شام ہے

وہ زمیں جو مرکزِ انوارِ علم و فضل تھی
اب جمود و جہل اُس کا اک مذاقِ عام ہے

وہ زمیں پیدا کئے جس نے سلاطین و ادیب
آج اپنی پستیوں سے ہر طرف بدنام ہے

فارغِ احساس بے فکروں کا یہ جمِ غفیر
روح سے محروم اک ہنگامۂ اجسام ہے

جیسے پروانے خرابِ صبح، بعدِ شمع ہوں
کچھ مجاور تربتوں کے گرد جیسے جمع ہوں

صبحِ مستقبل

آئے گا لیکن اک ایسا بھی زمانہ آئے گا
تیرگی کے بعد محفل پر اُجالا چھائے گا

جب ہُوا اہلِ وطن کے دل کو احساسِ وطن
یہ جمود و جہل دم بھر میں فنا ہو جائے گا

گردشِ عالم کبھی رہتی نہیں اک حال پر
جس نے پھیری ہے نظر وہ رحم بھی فرمائے گا

پھر منارِ تاج سے ہوگا نیا سورج طلوع
مدفنِ اکبر سے ماہ نَو کرن چمکائے گا

قلعے سے پھر سطوتِ اسلاف ہوگی جلوہ گر
رام باغ آرام کی جنّت سجا کر لائے گا

مسجدِ جامع سے اک تکبیر ہوگی پھر بلند
ساحلِ جمنا سے اک بادل نیا لہرائے گا

مولدِ غالب کی یہ ویرانیاں مٹ جائیں گی
نغمۂ سیماب اُس پر زندگی برسائے گا

اے مسافر یاد رکھنا یہ مرا پیغام ہے
یہ مرا پیغام تیری سیر کا انجام ہے

مزارِ اکبر

ہے یہ کس شاہنشہِ ذی مرتبت کی خوابگاہ
لے رہا ہے جس میں انگڑائی جلالِ بے پناہ
ذرّے ذرّے میں ہے جس کے ارتعاشِ مہر و ماہ
باریابی کے تخیّل سے لرزتی ہے نگاہ

سطوت و عظمت کی عبرت خیز اک تصویر ہے
حالِ صد جلوہ ماضی یہ اک تعمیر ہے

اس کی خلوت میں ہے خوابیدہ وہ بزم آرائے ہند
گونجتے تھے جس کی عظمت سے کبھی اقصائے ہند
جس کے فیضِ مرحمت سے تنگ تھا پہنائے ہند
ہند آج اس فیض سے محروم ہے اے وائے ہند!

گوشے گوشے سے ہے پیدا عہدِ انور کی صدا
آرہی ہے آج تک اللہ اکبر کی صدا

سمتِ مغرب عظمتِ نظارہ ہے اس کا مزار
جانبِ مشرق ہے اس کا قلعہ اب تک برقرار
ہیں دکن میں سیکری کے قصر اس کی یادگار
ہے شمالاً اس کا اک دیوانِ اعظم پردہ دار

آگرے پر چار جانب سے ہے یوں چھایا ہوا
جیسے کوئی ابرِ تر ہو جھوم کر آیا ہوا

گو کیا گردش نے اس روضے کو ویراں بار بار — صنعتیں اس کی مگر اب بھی ہیں فخرِ روزگار
روز کرتی ہے طواف ایران و کابل کی بہار — ہر گلِ نو، عہدِ اکبر کا ہے اک آئینہ دار

اس کے پائیں باغ سے نزہت ٹپکتی ہے ہنوز
نام لے کر عندلیب اس کا چہکتی ہے ہنوز

سب سے پہلی آگرہ کی یہ وہی تعمیر ہے — ہر عمارت جس کی اک اُتری ہوئی تصویر ہے
اس کے میناروں پہ فطرت مائلِ تکبیر ہے — اس کی دیواروں پہ اک ہنگامۂ تنویر ہے

اس کا عکس مرمریں بڑھ کر جو نور افشاں ہو
آفتابِ صبح ایسی شان سے تاباں ہو

آگرہ کی سرزمیں یوں ہند میں ممتاز ہے — اکبرِ ذیجاہ کی یہ خوابگاہِ ناز ہے
مرقدِ شاہِ جہاں سے بھی یہ سرافراز ہے — اس طرح دو بادشاہوں کی امینِ راز ہے

ہیں اسی عالم میں موجود اور عالم میں نہیں
کیا تماشہ ہے، ہمیں میں ہیں مگر ہم میں نہیں

سطوتِ ہندوستاں، اے اکبرِ عالی وقار! — مرجعِ انس و ملائک آج ہے تیرا مزار
پھول رحمت کے ہوا کرتے ہیں روز اس پر نثار — تو ہے زندہ، عظمتِ باقی ہے تیری زندہ دار
جب ترے روضے کی جانب رُخ کیا کرتے ہیں ہم — اک سلامِ عجز، تجھ کو کر لیا کرتے ہیں ہم

نورجہانِ ثانی

(شہزادی سکینہ بیگم)

کجکلاہی بھی وہی ہے کج ادائی بھی وُہی
ہے نگاہِ گرم کی صبر آزمائی بھی وُہی
ہے وہی شیر افگنی کا طور تیور سے عیاں
ہر ادا میں ہے مذاقِ خودنمائی بھی وُہی
ہیں وہی عہدِ جہانگیری کی سحر آرائیاں
چہرۂ تاباں کی ماہ و مہر زائی بھی وُہی
جاذبیت ہے وُہی خال و خدِ معصوم میں
اور ہے آنکھوں میں کیفِ انتہائی بھی وُہی
عظمت و عزمِ شجاعت بھی وُہی ہے جلوہ ریز
اور حوروں کا سا اندازِ نسائی بھی وُہی

جب تری ہستی کی کرنیں جلوہ افشاں ہو گئیں
بزمِ عالم میں نئی شمعیں فروزاں ہو گئیں

نام زندہ شاہِ عالم کا تری شہرت میں ہے
ذکر اب تک تیرا باقی درسِ حرّیت میں ہے

وہ ترا علمی تبحّر وہ ترا فضل و کمال
آج تک محفوظ تو ذہنیتِ فطرت میں ہے

ہے تری تصویر تکمیلِ تصور کی نشاط
جو فنا کا نقش بن کر دیدۂ عبرت میں ہے

جس پر اب تک ناز کرتی ہیں خواتینِ وطن
ایک ایسی بھی امانت خاک کی خلوت میں ہے

تیری شرحِ زندگی ہے جنّتِ اہلِ نظر
تو بھی اک عنوان تاریخِ نسائیت میں ہے

"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں"

لیبل تاج
درۂ تاج

فضائے تاج تیری دلنشیں معلوم ہوتی ہے
میں سچ کہدوں مجھے جنت یہیں معلوم ہوتی ہے

ضیا تیری ضیائے بہتریں معلوم ہوتی ہے
تری محراب حوروں کی جبیں معلوم ہوتی ہے

تری بنیاد میں اب تک نہ کوئی انقلاب آیا
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

تری تابانیوں کا کیوں نہ اس کو معجزہ کہئے
اندھیری رات بھی تو چودھویں معلوم ہوتی ہے

تری تعمیر دیتی ہے نگاہوں کو سکوں کیا کیا
تری تصویر کتنی دل گزیں معلوم ہوتی ہے

ترے نظارے میں جذبے محبت کے لرزتے ہیں
وفا و حسن کی تربت یہیں معلوم ہوتی ہے

تری معصومیت جس کو تخیل چھو نہیں سکتا
مجسم ایک خوابِ مرمریں معلوم ہوتی ہے

اگر ہوگی تو جنت نقل ہوگی تیرے باغوں کی
بہارِ خلد تیری خوشہ چیں معلوم ہوتی ہے

نمایاں ہیں ہر اک ذرے سے آثارِ درخشانی
یہ خاک اب تک ستاروں کی امیں معلوم ہوتی ہے

یہ وہ ماحول ہے جس کے محیطِ نور میں گھر کر
نگاہِ حسن اکثر شرمگیں معلوم ہوتی ہے

وہ عظمت، جو خفا ہو کر گئی ہے قومِ مسلم سے — حجابِ تاج میں گوشہ نشیں معلوم ہوتی ہے

وہ رفعت جس کا ماتم کر چکی ہے قسمتِ مسلم — انھیں تسکین گاہوں میں مکیں معلوم ہوتی ہے

وہ لذت، جذب کرتا ہے جو اس منظر سے نظارہ — محبت کی نگاہِ اولیں معلوم ہوتی ہے

ادب ملحوظ اے سیاح، روحِ عظمتِ شاہی — وقارِ سرو میں خلوت گزیں معلوم ہوتی ہے

حقیقت کی یہ وہ منزل ہے جس کے ذرے ذرے میں — تجلی ایک مہمانِ حسیں معلوم ہوتی ہے

نظر کے ساتھ سر جھکتا ہے ہر ہر گام پر میرا — مرے سجدوں کے قابل یہ زمیں معلوم ہوتی ہے

یہ عالم محویت کا وقتِ سیرِ تاج ہوتا ہے — کہیں ہوتا ہوں میں، دنیا کہیں معلوم ہوتی ہے

جسے سیمابؔ "ارضِ تاج" کہتے ہیں فرشتے بھی
وہ میرے ہی وطن کی سرزمیں معلوم ہوتی ہے

تاج

کنارِ شفق میں

افق کے لالہ زار سے گزر رہا ہے آفتاب / فضاؤں کو سلامِ شام کر رہا ہے آفتاب

طلائی تھال میں شفق سجا کے لائی شام کو / سکونِ منظر و نظر بنا کے لائی شام کو

گلوں کے قمقمے جلے، کنول جھکا ہوا اُٹھا / شفق ہوئی جو رنگ بارِ تاج جگمگا اُٹھا

یہ طائرانِ خوشنوا کبھی یہاں کبھی وہاں / سرود ریز و شور خیز و چہچہہ بیز و نغمہ خواں

قطار در قطار سرو پا بہ گِل کھڑے ہوئے / ستارے کیاریوں میں رنگ رنگ کے جڑے ہوئے

قدح یہاں سبو یہاں، بہار چار سُو یہاں / سمٹ کر آ گیا ہے اک جہانِ رنگ و بو یہاں

مگر حریمِ شاہ میں ہے عزمِ سیرِ شام کا / کہ ہو رہا ہے اہتمام محشرِ خرام کا

اُدھر شفق کا رنگ زر فشاں بنفشہ زار میں / اِدھر ریاضِ تاج رنگ و نور کی کنار میں

یہ ہلکے ہلکے سائے، یہ نکھار برگ و بار کا / کہ جیسے لمحہ اک یہی، شباب ہے بہار کا

شفق کا عکسِ شوخ پڑ رہا ہے فرقِ تاج پر / ہے عقل دنگ شیشۂ و شرر کے امتزاج پر

ضرورتِ ضیا، نہ روشنی کی احتیاج ہے / برس رہا ہے نور سا، یہ شمع ہے کہ تاج ہے؟

عروس تاج جلوہ گر ہے نور کے لباس میں
تڑپ رہی ہے برق طور، حور کے لباس میں

سمن بھی نسترن بھی فیضیاب اس کے نور سے
فضائے شام کی ہوا آب و تاب اس کے نور سے

بلا سے دھوپ ڈھل گئی، نہ ہو جو روشنی نہیں
فروغِ تاج سے تجلیات کی کمی نہیں

حجاب رنگ و بو میں ہے تجلیٔ دوام بھی
کرشمہ ہے یہ تاج کا کہ صبح بھی ہے شام بھی

جھلک نقابِ شام میں ہے لیلیٔ بہار کی
چمک نمودِ تاج میں ہے لعلِ شاہوار کی

یہ چمک رہا ہے تاج بھی شگفتہ ہیں گلاب بھی
ہیں قائم ایک ہی جگہ "شفق" بھی "آفتاب" بھی

نظیر اکبرآبادی

فطرت سے تخیل کو سرشار کیا تو نے
تصویر و تصوّر کو ہموار کیا تو نے

جب تار نہ تھے سازِ اصلاح کے جنبش میں
اُس وقت بھی دنیا کو بیدار کیا تو نے

جب مُہر زدہ گنجِ عرفان و حقائق تھا
عالم کو شناسائے اسرار کیا تو نے

جب تھا نہ کسی دل میں جذبہ وطنیت کا
ترکِ وطنیت سے انکار کیا تو نے

تھا تاج سے اس درجہ مانوس کہ مر کر بھی
آرام وہیں زیرِ دیوار کیا تو نے

ہے تاج کے سائے میں محفوظ بقا تیری
شہرت وہی باقی ہے تاج الشعرا تیری

صبحِ تاج

جب ہوئی ظلمت گہہ ہستی میں تخلیقِ سحر
چاند اور بے انتہا تاروں کی روحیں کھینچکر

التجا کی صبح نے یارب یہ کیا اندھیر ہے؟
میرے جلووں سے ضیا اندوز ہیں بحر اور بر

اپنے نظارے سے لیکن میں ہی خود محروم ہوں
اپنی صورت خود کبھی آتی نہیں مجھ کو نظر

رہ گیا بزمِ ازل میں شاید آئینہ مرا
اس لئے اپنی حقیقت سے ہوں ابتک بےخبر

دیکھتی ہے شام تصویرِ شفق میں اپنا رنگ
رات ہے آئینۂ مہتاب میں صورت نگر

آبجو میں عکس اپنا دیکھتا ہے ماہتاب
چاندنی میں پھول کو نازش ہے اپنے سائے پر

آفتاب آئینہ میرا ہو، یہ ممکن ہی نہیں
میں سراپا رنگ و نور اور آگ اس میں مستتر

فرصتِ تکمیل بہرِ حسرتِ دیرینہ دے
جیسے جلوے ہیں مرے ایسا ہی اک آئینہ دے

التجائے صبح پر آیا دلِ فطرت میں جوش
سیکڑوں آئینے پیدا کر دیئے جلوہ فروش

صبح نے ہر آئینے میں اپنی طلعت کی تلاش
صورتِ تصویر تھا لیکن ہر آئینہ خموش

تھا بدستور انتظار اس کو نئے عکاس کا
جو اُسی کی طرح ہو کوثر بہ دل جنت بدوش

تاج اُبھرا ایک تارے کی طرح تخئیل سے
ضو فشاں تابش چکاں نور آفریں تنویر کوش

ماہتاب شب ہو جس کی دید سے عارضِ حبیب
آفتاب صبح جس کو دیکھ کر ہو چہرہ پوش

مسکرائی صبح اپنی ہو بہو تصویر سے
مست ہو کر کیف سے جھومی بہ رنگِ بادہ نوش

آگیا لکھنے کو "شاعر" نظمِ صبحِ تاج" پر
نکہتِ گل نے دیا اُس کو یہ پیغامِ سروش

مدتوں سے مطلع الانوار ہے یہ آج کیا
"تاج" خود اک صبح ہے پھر ذکرِ صبحِ تاج کیا

دیال باغ

تمدن اور مذاہب نے جو کی ہنگامہ آرائی
کمالِ نفس نے سب سے الگ رہنے کی ٹھہرائی

خدائی ہے نتیجہ جذبۂ ترکِ خدائی کا
ہزاروں محفلوں کا رنگ ہے اور ایک تنہائی

خزاں پر غور کر کے چند پھولوں نے کیا ثابت
ہوا کرتی ہے یوں صحرا میں رہ کر گلشن آرائی

ملا جب درسِ نو لوگوں کو صانع کے تصور کا
حقیقت نے دماغِ روح میں لی ایک انگڑائی

یہی ہے بانگِ امروز اور یہی پیغامِ فردا بھی
یہاں تنظیم ہی سے دین بھی ملتا ہے دنیا بھی

شاہ جہانِ اعظم

اے نقشبندِ جلوۂ بے نام، اے شاہ جہاں ۔۔۔ اے پاسبانِ سطوتِ اسلام اے خلد آشیاں

کروٹ بدلوا دی ہر اک ذرّے کو تونے خاک کے ۔۔۔ اے وہ کہ اب تک یاد کرتا ہے تجھے ہندوستاں

عجزِ غلط کو تونے نازِ سرفرازی دے دیا ۔۔۔ حاشا کہ بارِ سجدہ سنگِ آستاں پر تھا گراں

تونے محبت کے صلے میں وہ امانت بخش دی ۔۔۔ روزِ ازل سے جو ترے ذہنِ رسا میں تھی نہاں

رنگِ بہارِ حسن کو کر کے فنا سے بے نیاز ۔۔۔ تونے عطا فرما دیا اک افتخارِ جاوداں

گلشن میں تیری گفتگو، کلیوں کو تیری آرزو ۔۔۔ پھولوں کو تیری جستجو، ان سب کی تو روحِ رواں

در سینۂ گل می دمد صد برقِ رنگین نامِ تو

از ذرہ ذرہ می چکد تو بادۂ الہامِ تو

دنیا اگرچہ فطرتاً اک محبسِ ظلمات ہے ۔۔۔ لیکن تری تعمیر سیلابِ تجلیات ہے

چھوڑا ہے اپنے بعد ایسا تونے نقشِ نوربار ۔۔۔ جو رات کو بھی دن ہی کہیئے صبح جسکی رات ہے

صدیاں گزر جائیں مگر تیری فنا ممکن نہیں ۔۔۔ دنیا میں تو باقی نہیں، یہ اعتباری بات ہے

اب بھی تری تصویر تاباں ہے بیاضِ تاج میں ۔۔۔ ہر برگ میں جلوہ ترا، ہر گل میں تیری ذات ہے

اب بھی پیامِ زندگی دیتی ہے تیری خوابگاہ
اب تک نواسنجی تری ہنگامۂ ذرات ہے

تو ہر روش پر تاج کی اب تک ہے مصروفِ خرام
یہ غیر فانی کارنامہ جانِ موجودات ہے

گو شد نقابِ مرگ، رد پوشِ تجلائے حیات
ثبت است بر ہر برگ بازِ تاج طغرائے حیات

جودہ بائی کا مندر

بت شکن بھی ہمتِ اسلام ہے بت گر بھی ہے
قلعۂ شاہی میں مسجد ہے جہاں مندر بھی ہے

فکر کی یکسوئی ہے بہرِ اطاعت لازمی
عقل میں گنجائشِ تعیینِ بام و در بھی ہے

ماورائے قیدِ تعیّن سے ہے نیرنگِ جمال
مظہر اس کا آگ بھی ہے، خاک بھی، پتھر بھی ہے

اے عبودیت، نظر میں وسعتیں درکار ہیں
بتکدہ کہتے ہیں جس کو وہ خدا کا گھر بھی ہے

برہمن اور شیخ ہیں پابندِ اوہام و رسوم
اک پرستش کا طریقہ اس سے بالاتر بھی ہے

ہوتی ہے آغوشِ باطل سے حقیقت کی نمود
جو خلیل اللہ ہے، پروردۂ آذر بھی ہے

کیوں مساوات اب نہیں پیرایۂ اسلام میں؟
کفر برسوں پل چکا ہے سایۂ اسلام میں

روضۂ ممتاز اور مقبرۂ نورجہاں

سبزہ زار و بلبلے! —— نے چراغ و نے گلے!

الاماں اے انقلابِ آسماں تیری ستم رانی
ہزاروں فتنہ ساماں ہیں خرابِ فتنہ سامانی

جو کل تک پھول کلیوں سے سبک تھے باغِ عالم میں
لبِ خاموش سے ہیں آج شاکیِ گراں جانی

جنھیں کل قاقم و سنجاب میں تکلیف ہوتی تھی
انھیں ہے خاک میں تسکین، بعدِ خانہ ویرانی

کفن میں منھ چھپائے بیکس و مجبور سوتے ہیں
جنھیں تھا عالمِ موہوم میں نازِ جہاں بانی

مسلط ہے فنا عالم میں ہر اک نقشِ ہستی پر
یہ نازِ حسن بھی فانی نیازِ عشق بھی فانی

بقا خود سلب کر لیتی ہے جودت آدمیت کی
یہاں "شیر افگنی" چلتی نہیں اربابِ قوت کی

رہی نورِ جہاں، ممتاز بیگم سے خفا برسوں
ابھرنے ہی نہ اسکی شان و شوکت کو دیا برسوں

کیا ممتاز کے ہر امتیازِ خاص پر قبضہ
جفائے تازہ برسوں کی، ستم رکھا روا برسوں

مگر بعدِ فنا، نطرت بلا کی منتقم نکلی
زمانہ انقلابِ مستقل پر روئے گا برسوں

ادھر ہے مرقدِ ممتاز پہ ہر وقت گل باری
ادھر جاتی نہیں خوش رنگ پھولوں کی ہوا برسوں

اِدھر کویل بھی ہے بلبل بھی، طوطی بھی، پپیہا بھی
اُدھر آتی نہیں زاغ و زغن کی بھی صدا برسوں

یہاں اک محشرِ صد رنگ و بو ہر وقت برپا ہے
وہاں اک ہُو کا عالم ہیبت افزائے تماشا ہے

اُدھر نور جہاں کی قبر پر حسرت برستی ہے
اِدھر ممتاز کا مرقد نگارستانِ ہستی ہے

اُدھر ہے اک نشیبی مقبرہ افسانۂ عبرت
اِدھر اک تاج ابتک ارتقائے نقشِ پستی ہے

گرانی ہی گرانی ہے اُدھر ناظر کی نظروں پر
جوانی ہی جوانی ہے، اِدھر مستی ہی مستی ہے

اُدھر اک مقبرہ ہے منہدم سا اور شکستہ سا
اِدھر اک مرمریں روضہ ہے اور جلووں کی بستی ہے

اُدھر کچھ گرم جھونکے لُو کے ہیں اور موسمی وہ بھی
ہوائے گل اِدھر خلد آفریں ہے اور مستی ہے

نگاہِ شوق اُدھر جانے میں سو سو ناز کرتی ہے
اِدھر فطرت طوافِ روضۂ ممتاز کرتی ہے

وہاں مشکل سے ہوتا ہے میسر اک گلِ تر بھی
یہاں جنت بھی ہے تسنیم بھی ہے اور کوثر بھی

وہاں صرف ایک تہ خانہ ہے وہ بھی تار اور تیرہ
یہاں آئینہ بندی سے درخشاں ہے محجّر بھی

وہاں دن بھی ہجومِ یاس سے تاریک رہتا ہے
یہاں آتا ہے لینے روشنی ماہِ منور بھی

وہاں عبرت ہی عبرت ہے یہاں رحمت ہی رحمت ہے
وہاں معدوم مدفن تک یہاں زندہ ہے منظر بھی

جہاں میں شہرتِ نور جہاں گو آج باقی ہے
مگر ممتاز کے سر پر ابھی تک "تاج" باقی ہے

چاند اور تاج

چاند:—

اے عروسِ ہند سیرِ شب کو جب آتا ہوں میں
محوِ نازش اپنے جلووں میں تجھے پاتا ہوں میں

میری دنیا سے کوئی تارا گرا تھا ٹوٹ کر
ہو گئیں ساحل پہ قائم اس کی کرنیں پھوٹ کر

میری نظروں میں وہی افتادہ اک انجم ہے تو
کیوں غرور و ناز و رفعت کی فضا میں گم ہے تو

عالمِ پستی میں تیرا نام بالا مجھ سے ہے
روشنی تجھ سے نہیں ہے یہ اجالا مجھ سے ہے

دور ہو جاتی ہے ساری تیرگیٔ دل تری
جگمگا اٹھتی ہے کرنوں سے مری محفل تری

چاندنی میری بڑھا دیتی ہے تیرے حسن کو
جلوہ پیرائی سکھا دیتی ہے تیرے حسن کو

ہے یہ تیرا امرِ مریں انبار اک بارِ نظر
تربتِ ممتاز اور صاحبقراں کی قبر پر

تو ہے ہر سیاح کی نظروں میں مہر و ماہتاب
اور وہ مدفن کی تاریکی میں صرفِ انقلاب

ڈھیر تیرا دونوں قبروں کے لئے ہے اک حجاب
گھیر لی ہے وسعتوں نے تیری ان کی آب و تاب

سامنے اس پاک تہ خانے کے جب آتا ہوں میں
مرقدِ ممتاز پر انوار پھیلاتا ہوں میں

محفلِ ہستی کے گل ہو جانے والے اے چراغ!
تو زمیں پر ہے اور ہے افلاک پر تیرا دماغ!

جب کوئی بادِ فنا کا تند جھونکا آئے گا
منہدم ہو کر ذرا سی دیر میں رہ جائے گا

قرض لے کر مجھ سے، اپنے نور پر نازاں نہ ہو
نقش خاکی ہے، مثال کہکشاں رخشاں نہ ہو

میری محفل، لازوال آئینۂ ایام ہے
اے نگارِ بزمِ فانی تو فنا انجام ہے

تاج :-

اے امیرِ کاروانِ شب سنا شکوہ ترا
ہے غلط تنقید، مہمل طعنۂ بے جا ترا

سرد کرنوں میں چھپا کر زہر کے نشتر نہ پھینک
آسماں والے زمیں پر رات کو پتھر نہ پھینک

مستیوں میں اپنے کیف و رنگ کے مدہوش ہوں
اس لئے یہ لن ترانی ہے کہ ہیں خاموش ہوں؟

ذہن پر تیرے کدورت کا اندھیرا چھا گیا
چار دن کی چاندنی پر اس قدر اترا گیا!

ہو حقیقت سے جو تو واقف تو یہ باتیں نہ ہوں
آ کبھی اس وقت بھی، جب چاندنی راتیں نہ ہوں

ظلمتِ شب میں بھی میری بارش تنویر دیکھ
ہر ورق پر پھول کے، اک چاند کی تصویر دیکھ

تو اندھیری رات میں اکبار جب آیا نہیں
آ گیا کیونکر تجھے اپنے خیالوں پر یقیں؟

میں تری دنیا کا اک افتادہ سیارہ نہیں
دیکھ قائم اپنے مرکز پر ہوں، آوارہ نہیں

میں امینِ راز ہوں، انجام اور آغاز کا
سطوتِ صاحبقران و جلوۂ ممتاز کا

ہیں مری آغوش میں وہ آفتاب و ماہتاب
تیری دنیا بھی نہ ابتک دے سکی جن کا جواب

میں اگر دامن اٹھا لوں اُن کی قبرِ پاک سے
آسماں تھرا اُٹھے نظارۂ غمناک سے

کیوں ہوا حیراں جو یہ حسرت کدا پردے میں ہو
اے چراغِ شام خود تیرا خدا پردے میں ہے

باطنی شمعوں سے رخشندہ وہ خلوت خانہ ہو
ہر کرن تیری جہاں بھٹکا ہوا پروانہ ہے

وہ نہیں محتاج تیری چاندنی کے رات میں
رات دن تاباں ہے حسنِ ذات اُنکی ذات میں

طعنِ قرضِ نور کیوں دیتا ہے مجھ کو بار بار
کیا نہیں معلوم تو سورج کا خود ہے قرضدار؟

ایک حالت پر ہوں میں مصروفِ تابش رات دن
اور تو ہے آسماں پر صرفِ کاہش رات دن

کیا کہا تو نے کہ فطرت کو نہیں تیری زوال؟
بدر سے یہ کون بن جاتا ہے گھٹ کر ہلال؟

صبح کے ہوتے ہی چہرہ کس کا ہو جاتا ہے فق؟
کون رہ جاتا ہے بن کر دن کو تانبے کا ورق؟

میں شب و روز ایک ہی انداز سے ضوبار ہوں
اس جہاں کی مستقل اک دولتِ بیدار ہوں

طاق میں تہ کر کے رکھ احسان کی چادر نہ پھینک
ہو سکے تجھ سے تو اپنی چاندنی مجھ پر نہ پھینک

دیکھ پھر کس طرح اپنا نور برساتا ہوں میں
دیکھ پھر کیوں کر مجسم چاند بن جاتا ہوں میں

ہاں فنا انجام ہوں، اس کا مجھے اقرار ہے
لیکن اس میں بھی ہے میری جیت تیری ہار ہے

تجھ کو اپنی عمر میں خوفِ فنا ہے بار بار
میری فطرت کو نمودِ حشر کا ہے انتظار

حشر تک یہ میرا استحکام مٹ سکتا نہیں
میں تو مٹ سکتا ہوں میرا نام مٹ سکتا نہیں

ہوں خجل تجھ سے نہ تیری روشنی سے ماند ہوں
آسماں کا چاند تو ہے، میں زمیں کا چاند ہوں

(شبِ تاریک میں)

راتِ آئی پردۂ تاریک پھیلاتی ہوئی
جلوۂ شام و شفق کے ساتھ اتراتی ہوئی

حکمرانی ہو گئی ظلمت کی دشت و باغ پر
روشنی سمٹی ہر اک گوشے سے شرماتی ہوئی

ناگہاں مغرب سے اک خاموش تاریکی بڑھی
جگنوؤں کے روپ میں تارے سے چمکاتی ہوئی

جل اُٹھیں شمعیں کہ عالم میں اندھیرا ہو گیا
اور پروانوں کی دُنیا میں سویرا ہو گیا

اک اُداسی ہر جگہ ہر چیز پر طاری ہوئی
عالمِ اجسام میں مرنے کی تیاری ہوئی

خواب نے انگڑائیاں لیں، لی جماہی کسل نے
انجمن میں بے خودی کی گرم بازاری ہوئی

اک نقابِ جلوہ دشمن میں مناظر چھپ گئے
حسن کو بارِ تماشا سے سبکساری ہوئی

غرق اک سیّال مستی میں زمانہ ہو گیا
ہو گیا غافل مصوّر، اور شاعر سو گیا

ہاں مگر اک تاج ہے اس وقت لعلِ شب چراغ
نور اس کا ہے نمایاں بجھ گئے ہیں سب چراغ

چاند سے گنبد کے پیدا ہے طلائی روشنی　　پھول کے معنی تجلی غنچے کا مطلب چراغ
لا دیتا پانی میں اس کی اس کا عالم دیکھ لیں　　کون اب فانوس مانگے، کون ڈھونڈے اب چراغ

اس کے سائے میں گیاہ سبز نخلِ طور ہے
زندگی اس کے اندھیرے میں ہمیں منظور ہے

شمع بن کر حوض میں اس کے شگفتہ ہیں کنول　　چاندنی کا پھول ہے گویا شبِ مہ کا بدل
خلوتِ سبزہ میں ہیں جگنو چراغانِ بہار　　نسترین و نسترن کا ہر روش پہ ہے عمل
اس کا عکسِ مرمریں ماحول پر ہے نور بار　　جب اُدھر دیکھا تو گویا آفتاب آیا نکل

ہر روش پر زندگی کے مرتسم عنوان ہیں
تاج کی تو رات میں بھی صبح کے سامان ہیں

تاج اک موتی ہے، موتی نور کا جویا نہیں　　تاج اک تارا ہے، تارا خواب کا تشنا نہیں
رات دن بیدار پُرانوار، سرشارِ بہار　　تاج ہے اک چاند قسمت چاند کو سونا نہیں
پردۂ تاریکِ شب غالب ہو اس پر کس طرح　　تاج اک سورج ہے اور سورج کبھی چھپتا نہیں

ہیں جو ظلمت جذب کر لینے کے جوہر تاج میں
نور بن جاتی ہے خود بھی رات آ کر تاج میں

تاج منہ سے بولتا ہو ساری دنیا ہے خموش　　تاج اب تک ہے درخشاں تاج والا ہے خموش

رات کو "آ تاج" میں اور نغمۂ اسرار سُن | گلستانِ "تاج" کا گو پتّہ پتّہ ہے خموش
کوئی سُن سکتا ہو سب کچھ اور کوئی کچھ نہیں | ذرّہ ذرّہ نغمہ گر ہے، ذرّہ ذرّہ ہے خموش

ساری دُنیا سو رہی ہے تاج جلوہ بار ہے
مادیت خواب میں، روحانیت بیدار ہے

قصر الادب

تعالیٰ اللہ! ارضِ "تاج" سرافرازیاں تیری | عروجِ اکبرؔ شاہِ جہاں کے عہدِ رفعت میں
ترے گھر میں پڑی بنیاد اس ایوانِ عالی کی | "ادب" کہتے ہیں جس کو اصطلاحِ علم و حکمت میں
تری ہی خاک سے پیدا ہوئے میرؔ اور غالبؔ بھی | ہیں تیرے ہی عناصر کارفرما میری خلقت میں
ستاسی سال بعدِ میرؔ ہے تخلیق غالبؔ کی | یہی وقفہ ہے میری اور غالبؔ کی ولادت میں
"ادب" کی ہر صدی میں فطرتاً تجدید ہوتی ہے | بدل جاتا ہے اسلوبِ کہن اک خاص مدت میں
تراوش میری ہستی کی ہوئی ہے ذہنِ فطرت سے | مرے بعد آئے گا اب کون؟ یہ ہے ذہنِ فطرت میں
"ادب" کو میرے انفاسِ جواں نے زندگی بخشی | نیا اک سوز پیدا کر دیا سازِ قدامت میں

جہاں منزل پہ میرے کارواں کے بعد پہنچے گا
امیرِ کارواں ہے کارواں میرا حقیقت میں

---

[۱] ولادتِ میرؔ در اکبرآباد ۱۱۲۵ھ، [۲] ولادتِ غالبؔ در اکبرآباد ۱۲۱۲ھ، [۳] ولادتِ سیمابؔ در اکبرآباد ۱۲۹۹ھ

شاہجہاں کی آخری ہچکی

خلوت کی برہم سامانیوں میں مطلق اُداسی چھائی ہوئی ہے
پُرہول شب کی ویرانیوں میں، عبرت کی سلعت آئی ہوئی ہے
شاہِ جہاں ہے موجودِ بستر، یا ہے تخیّل شاہِ جہاں کا
کیا یہ وہی ہے سلطانِ کشور، جو حکمراں تھا ہندوستاں کا
شمعِ حرم کے آنسو ہیں جاری ہے ایک لرزش قلعے پہ طاری
خلوت کی برہم سامانیوں میں، پُرہول شب کی ویرانیوں میں
مطلق اُداسی چھائی ہوئی ہے
عبرت کی ساعت آئی ہوئی ہے
شاہِ جہاں ہے بیزارِ دنیا، بالیں سے دنیا لپٹی ہوئی ہے
دل کو ہے فکرِ ترکِ تمنّا، دل سے تمنّا لپٹی ہوئی ہے

خیل حشم کی تاج و علم کی، دنیا ادب سے ہے پیشِ خدمت
دیہیم و افسر، اقلیم و عسکر، صد ہا خزانے، معمورِ دولت
تاریخِ ماضی ہنگامہ در بر پیشِ نظر ہے آئینہ بن کر
شاہِ جہاں ہے بیزارِ دنیا دل کو ہے فکرِ ترکِ تمنا
بالیں سے دنیا لپٹی ہوئی ہے
دل سے تمنا لپٹی ہوئی ہے
ہے "تاج" حدِ چشمِ تماشا، آمد کسی کی ہے آج اس میں
جنت بنی ہے نظروں کی دنیا، وہ "تاج" میں ہے اور تاج اس میں
آئی ہے لینے ممتاز بانو، زلفوں میں اس کی بوئے ارم ہے
آنکھوں سے جاری اشکِ محبت، لب پر تبسم رومانِ غم ہے
قیدِ فنا سے تحلیل ہو کر نقشِ بقا میں تبدیل ہو کر
ہے تاج حدِ چشمِ تماشا، جنت بنی ہے نظروں کی دنیا
آمد کسی کی ہے آج اس میں
وہ "تاج" میں ہے اور تاج اس میں

اب حکمرانی ہے اک کہانی، ہوتا ہے رخصت سلطانِ عالی
اے زندگانی، کر نوحہ خوانی، خالی پڑا ہے ایوانِ عالی
معمورِ حسرت، مجبورِ رحلت، دارِ فنا سے، ہے "تاج" والا
محتاج بھی ہے تاراج بھی ہے، یاقوت لعل اور پکھراج والا
ہے اختتامِ صاحبقرانی — اَللّٰہُ بَاقِیْ مِنْ کُلِّ فَانِیْ
اب حکمرانی ہے اک کہانی، اے زندگانی کر نوحہ خوانی
ہوتا ہے رخصت سلطانِ عالی
خالی پڑا ہے ایوانِ عالی

(کتبہٗ محمد عبدالحق اکبرآبادی شاگرد عبدالرحمٰن اکبرآبادی)
۶۴۶ء — ۳۶۶ھ